معارف کا زرِ تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپے فی شمارہ پانچ روپے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج ۔ اسٹریچن روڈ ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں ، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUL MUSANNBFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے ، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے ، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ——— رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۰ ماہ جمادی الاخریٰ ۱۴۱۳ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۹۲ء عدد ۶

مضامین

شذرات

۶؍ دسمبر کو گاندھی جی کے سیکولر ہندوستان میں رام چندر جی کے بھگتوں نے بابری مسجد کو شہید کر ڈالا. ابھی وہ اپنی فتح کا جشن بھی نہیں منا سکے تھے کہ پورے ملک میں تشدد کی آگ بھڑک اٹھی. ان سطروں کی تحریر کے وقت تک دو سو سے زیادہ آدمی مارے جا چکے ہیں. بابری مسجد کو شہید کرنے والے داد کے مستحق اس وقت ہوتے جب وہ اپنے مدمقابل کی عبادت گاہ کو مسمار کر کے اپنی مردانگی اور بہادری کا جوہر دکھاتے. انھوں نے اپنا کارنامہ دکھانے کیلئے اس قوم کی عبادت گاہ کا انتخاب کیا جو مجبور اور بے بس ہے. جس کے ساتھ دوہرا معیار اختیار کیا جاتا ہے. اور جس کو لوٹنے مارنے میں محافظین بھی شریک رہتے ہیں. کیا ایسے مجبور و بے بس لوگوں کی عبادت گاہ کو ڈھا دینا بہادری ہے؟ اور کیا رواداری اور عدم تشدد پر عقیدہ رکھنے والوں کے کارنامے ایسے ہی ہوتے ہیں ع تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو

بابری مسجد کو شہید کرنے والے جس طرح کے لوگ ہیں اور جن طبقوں سے ان کا تعلق ہے' ان سے حکومت طاقت اور دولت کے بل پر ہر قسم کا کام لیا جا سکتا ہے. کیا اگر حکومت نہ چاہتی تو مسجد شہید کی جا سکتی تھی؟ صوبائی حکومت تو یہ کارنامہ انجام دینے میں پوری طرح شریک رہی ہے. بھارتیہ جنتا پارٹی کو اس پر کوئی پچھتاوا بھی نہیں ہے. اور پچھتاوا کیوں ہو؟ وہ پچھلے چند برسوں سے تمام قومی مسائل کو نظر انداز کر کے صرف اسی ایک مہم کو سرانجام دینے میں مصروف تھی. مرکزی حکومت کو بھی کیسے بری الذمہ سمجھا جا سکتا ہے؟ سنہ ۱۹۴۹ء ہی سے مسجد کو مندر بنانے والے اقدامات ہو رہے تھے. اس دفعہ بھی جب مسجد شہید ہو گئی اور کارسیوک "باعزت" واپس چلے گئے' تب اسے مسجد بچانے یا شاید اس کی تربت پر فاتحہ پڑھنے کا خیال آیا ؎

مری میت پہ اب آیا ہے ظالم بال بکھرائے ✽ کہو یہ شکل جیتے جی دکھا دیتا تو کیا ہوتا!

اب بھی وہ مسجد کی از سر نو تعمیر کی بات کہہ رہی ہے جس پر کیسے یقین آئے. مسجد میں تو بتوں کی پوجا ہو رہی ہے. آخر مسلمانوں کو کب تک فریب دیا جائے گا.

مسلمان مسجد کی شہادت پر تڑپ رہے ہیں' لیکن اپنا درد کس سے کہیں؟ ملک میں ہر طرف تشدد پسندوں کا

بول بالا ہے' جو آئین و قانون کی بات بھی سننے اور ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں. تاہم ان صبر آزما حالات اور اذیت رساں واقعات کے باوجود انھیں صبر و ضبط سے کام لینا اور ملک میں امن و امان قائم رکھنا ہے. ان کے لیے زمین کا چپہ چپہ مسجد ہے. ارشاد نبوی ہے: جعلت لی الارض مسجدا وطهورا. شرپسندوں کے غلبہ کے باوجود حق و صداقت اور عدل و انصاف کی بات کرنے والے بھی ملک میں موجود ہیں اور وہ ان واقعات کی شدید مذمت کر رہے ہیں ان کے نزدیک بابری مسجد نہیں شہید ہوئی ہے بلکہ ہندوستانی جمہوریت اور سیکولرزم کی بنیادیں ڈھ گئی ہیں اور پوری دنیا میں ملک رسوا اور بدنام ہو رہا ہے. اس وقت جمہوریت پسندوں کی یہ آواز گو نحیف اور غیر موثر ہو گئی ہے لیکن ایک دن یہی پورے ملک میں گونج کر رہے گی.

چاہے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے یہ واقعہ کتنا ہی غمناک کیوں نہ ہو لیکن اس میں ان کے لیے درس و پیام بھی ہے. ان کا عقیدہ ہے کہ دنیا کی باگ ڈور خدا کے ہاتھ میں ہے. یہاں بخت و اتفاق کے بجائے ہر واقعہ اللہ کے حکم سے پیش آتا ہے جو حق و عدل پر مبنی ہوتا ہے جب مسلمانوں کے اندر وہ خرابیاں پیدا ہو گئیں جو کسی قوم کو خدا کے تازیانہ کا مستحق بناتی ہیں تو وہ اس سے اس لیے نہیں بچ سکتے کہ ان کے عقائد و رسوم دوسروں سے اچھے ہیں. کیونکہ اجتماعی زندگی کو بنانے میں صرف یہی کافی نہیں ہے. بلکہ اصل چیز اجتماعی و انفرادی کردار ہے. اگر یہ نہ ہو تو محض عقائد و رسوم کام نہیں دیتے. اس واقعہ نے مسلمانوں کو اپنے حالات و معاملات کی اصلاح اور انھیں از سر نو منظم ہو جانے کا موقع بخشا ہے. کاش وہ اس تخریب سے اپنی تعمیر کا راستہ ہموار کر لیتے ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ✽ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم ✽ مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

مسلمان مذہب کے معاملہ میں بڑے حساس ہیں. اس لیے ہندوستانی مسلمان اپنی مسجد سے دستبردار نہیں ہو سکتے. لیکن اس کے ردعمل میں کسی مندر کو توڑنے کا خیال بھی انھیں نہیں ہونا چاہیے. بابری مسجد کے انہدام کے ذمہ دار پاکستان اور بنگلہ دیش کے ہندو نہیں ہیں. اس کے لیے ان کو تشدد کا نشانہ

بنانا اور ان کے مندر ڈھانا شرمناک اور اسلامی تعلیم کے منافی ہے۔ اس طرح کا اقدام ہندوستانی مسلمانوں کے مفاد کے خلاف بھی ہے۔

صرف بابری مسجد کا سوال نہیں ہے، بلکہ اس وقت ملک نہایت نازک اور کٹھن دور سے گزر رہا ہے۔ تشدد، شرپسندی اور فرقہ پرستی کی آندھی سیکولرزم، جمہوریت، امن وامان اور آئین وقانون سب کو خس وخاشاک کی طرح اڑالے جانا چاہتی ہے۔ اس طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے کانگریس اور سیکولر جماعتوں کو انسانیت اور ملک کے مفاد میں متحد ہوجانا چاہیے۔ گاؤں گاؤں اور محلہ محلہ میں جاکر نفرت واشتعال کو ختم کرکے اخوت اور بھائی چارگی کی فضا پیدا کرنی چاہیے۔ ووٹ کی سیاست چھوڑ کر جمہوریت اور آئین کی بالادستی قائم رکھنے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ اگر شرپسندی، فرقہ داریت اور تشدد کا جنون کم نہ ہوا تو ملک تباہ ہونے سے بچ نہیں سکتا۔ جس کی ذمہ داری فرقہ پرستوں سے زیادہ قوم پرستوں، وطن دوستوں اور سیکولر پسندوں پر ہوگی جو اپنے گھروں میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے۔

گذشتہ ماہ متعدد اصحاب علم وفضل دارالمصنفین تشریف لائے۔ مولانا نظام الدین ناظم امارت شرعیہ بہار، واڑیسہ، مولانا مجاہدالاسلام قاسمی قاضیٔ شریعت پٹنہ سے اور مولانا مفتی ظفیرالدین دارالعلوم دیوبند سے اور ڈاکٹر سید صاحب عمرآباد سے اپنے متعدد رفقاء کے ساتھ آئے۔ دو عرب فضلا جناب محمد الحروس (عراق) صدر جمعیۃ امام ابوحنیفۃ النعمان اور علی محمد جمعہ (مصر) نے بھی قدم رنجہ فرمایا مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی کلکتہ سے شبلی نیشنل کالج کی دعوت پر تشریف لائے تھے مگر ان کا قیام دارالمصنفین ہی میں تھا۔ ان سے اور پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی سے جو دہلی سے تشریف لائے تھے، رفقائے دارالمصنفین نے علمی، دینی اور قومی وملی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا اور ان کے خیالات سے مستفید ہوئے۔ دارالمصنفین کے ایک بڑے کرم فرما اور مخلص قدردان جناب ہوشدار خان صاحب نے بھی میزبانی کا شرف بخشا۔ ان کا وطن بھٹکل ہے مگر کاروبار قطر میں ہے۔ اسی اثنا میں دارالمصنفین کے معتمد جناب سید شہاب الدین دسنوی نے بھی رونق بخشی۔

مقالات

میر محمد مومن عرشی اکبرآبادی

از پروفیسر نذیر احمد

میر محمد مومن عرشی اکبرآبادی میر عبداللہ مشکیں قلم ترمذی اکبرآبادی (م: ۱۰۳۵ھ) کے دوسرے بیٹے تھے، میر عبداللہ مشکیں قلم آگرے کے ایک علمی خانوادے کے رکن تھے، ان کا وطن ترمذ[1] تھا جو دریائے جیحوں کے اس پار جمہوریہ تاجکستان میں واقع ہے، مشکیں قلم نے اکبر اور جہانگیر کے دور میں ادب وشعر وفن خطاطی میں بڑی ناموری حاصل کی تھی۔ اکبر کی طرف سے ان کو مشکیں قلم کا خطاب ملا تھا[2] اس سے ظاہر ہے کہ خطاطی میں انھوں نے بڑا کمال حاصل کرلیا تھا، وہ عارف باللہ تھے اور چشتیہ سلسلہ سے منسلک تھے، صاحب دیوان[3]

---

[1] ترمذ وہی مقام ہے جس کی طرف "جامع ترمذی" کے مصنف امام محمد بن عیسیٰ بن سورۃ متوفی ۲۷۹ھ منسوب تھے، ترمذی سادات ہندوستان میں کافی تعداد میں پائے جاتے تھے، مشکیں قلم کے معاصرین ترمذی سادات آگرہ یعنی اکبرآباد میں تھے، شاہجہانی عہد میں محمد فاضل بن سید حسن حسینی ترمذی اکبرآبادی نے ۱۰۶۶ھ میں "مخبر الواصلین" نام کا ایک تذکرہ لکھا جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر ۱۰۶۶ھ تک کے ممتاز اشخاص کی تاریخ وفات وغیرہ درج ہے، اس میں بعد میں ۱۱۰۵ھ تک کے افراد کی تاریخ درج کر دی گئی ہے۔ [2] تذکرۂ مرآۃ العالم ج ۲ ص ۸۳۴ میں ہے کہ یہ لقب اکبر اور جہانگیر کی طرف سے ملا تھا، لیکن اکبر ہی کی طرف سے یہ لقب ملا ہوگا اس لیے کہ ۱۰۰۴ھ کے ایک کتبے میں میر کا نام عبداللہ مشکیں قلم الحسینی الترمذی ملتا ہے [3] شعری یادگار میں صرف مثنوی گلشن اسرار باقی ہے۔

شاعر تھے، خمسۂ نظامی کے جواب میں ان کی پانچ مثنویاں تھیں جن میں سے مخزن کے
مقابل مثنوی گلشن اسرار موجود ہے جس کا ایک نادر نسخہ سالار جنگ میوزیم (فہرست کتابخانہ
ج ۵، نمبر ۱۸۴۷/ ۸۱۳) میں محفوظ ہے[1]، ان کے مرشد مولانا فیض اللہ سہارنپوری تھے، انکی
خطاطی کے کافی نمونے ہنوز موجود ہیں[2]، ان کا کتابت کیا ہوا دیوان حسن دہلوی کا نسخہ بالٹی مور
(امریکا) کے میوزیم کی زینت ہے، اس کے علاوہ متعدد کتبوں اور خطاطی کے نمونوں کی نشاندہی
ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی کے ایک مقالے میں ملے گی جو مجلہ معارف اعظم گڈھ اپریل ۱۹۹۱ء کے
شمارے میں شایع ہوا ہے، ان کی خطاطی کا ایک قابل ذکر نمونہ شاہ بیگم کے مزار کا کتبہ ہے[3]،
جو خسرو باغ الہ آباد میں ہنوز محفوظ ہے، میر عبد اللہ کا مزار آگرہ میں آگرہ سکندرہ آبادی پاس
پر تلسی سینما کے ذرا آگے محلہ جواہر نگلا کے ایک احاطے میں ہے، مزار کے کمرے کی
دیواروں پر ان کے بیٹے میر محمد صالح کشفی کے[4] دو قطعے درج ہیں جن سے تاریخ وفات
۱۰۳۵ھ متعین ہو جاتی ہے۔ ان تحریروں سے میر عبد اللہ کا باقاعدہ صوفی ہونا مسلم ہو جاتا
ہے۔ میر عبد اللہ مشکیں قلم کے بڑے بیٹے میر محمد[5] صالح عرشی تھے، وہ شاہجہاں کے عہد کے

---

[1] ان کی مدح میں گلشن اسرار کا ۲۹واں باب مختص ہے، اس کے کچھ اشعار راقم حروف کے مقالہ
میر صالح کشفی اور ان کی تصنیف "مناقب مرتضوی" مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ج ۱۶ شمارہ ۱-۲
ص ۸ ح میں نقل ہے [2] اس کے ایک صفحے کے عکس کے لیے جس میں خود میر عبد اللہ مشکیں قلم کی تصویر
شامل ہے، دیکھئے W.E. Begley: Monumental Islamic Calligr-
-aphy from India, U.S.A. 1985 Catalogue, p. 7. [3] ایضاً ص ۱۰-۱۱
[4] ان تعلقات میں انکو عارف اور صوفی بتایا گیا ہے اور ان کی نسبت چشتیہ سلسلے سے بتائی گئی ہے [5] انکے حالات
کے لیے دیکھئے میرا مقالہ مجلہ علوم اسلامیہ ج ۱۶ شمارہ ۱-۲۔

منصبدار اور بڑے ذی علم تھے۔ جن پر راقم السطور کا ایک کسی قدر مفصل مضمون مجلہ علوم اسلامیہ
علی گڑھ کے حالیہ شمارہ جلد ۱۶، نمبر ۱-۲ بابت ۱۹۹۰-۹۱، میں شایع ہوا ہے، اس میں
اس خانوادے کے بزرگوں کے علاوہ میر عبد اللہ مشکیں قلم اور میر مومن عرشی کے بارے میں
اطلاعات بہم پہنچائی گئی ہیں، دراصل میر صالح کشفی کے اس مقالے میں کشفی کی ایک مشہور تصنیف
مناقب مرتضوی کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے، اس تصنیف کا شمار اپنے زمانے کی مشہور ترین
عرفانی و علمی تصانیف میں ہوتا ہے، کشفی شاہجہانی دور کے منصبدار تھے جن کا انتقال
۱۰۶۰ھ میں ہوا، صاحب ترجمہ میر مومن عرشی میر صالح کشفی کے برادر خورد اور انہیں کے
تربیت یافتہ تھے، ان کے بارے میں تذکروں اور تاریخوں سے کم اطلاعات ملتی ہیں یہی
حال ان کے والد اور ان کے برادر بزرگ کا بھی ہے، دراصل انکے متعلق جو مواد حاصل
ہوا ہے وہ ان کی کتابوں سے حاصل ہوا ہے جو باوجود مختصر ہونے کے نہایت مستند
اور قیمتی ہے، عرشی اس لحاظ سے اپنے خاندان کے سارے افراد میں زیادہ خوش نصیب
ہیں کہ ان کی زیادہ تحریریں باقی رہ گئی ہیں، مثلاً ان کا دیوان شعر محفوظ ہے جس کے کئی
نسخے ملتے ہیں، اس کا ذکر بعد میں آئے گا، دیوان کے علاوہ ان کی کم از کم تین مثنویاں موجود
ہیں، دیوان اشعار کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بحیثیت شاعر وہ اپنے والد بزرگوار
اور بڑے بھائی کشفی سے ممتاز تھے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کا دیوان مدون ہوا
اور اس کے نسخے باقی رہ گئے، ان کا دیوان ان کی زندگی میں مرتب ہو چکا تھا چنانچہ
ایک نسخہ[1] ۱۰۴۳ھ کا مکتوبہ جو وفات سے ۱۸ سال قبل کا ہے، سالار جنگ میوزیم کی

---

[1] مخطوطہ ۱۹۵۵، فہرست ج ۵، اس کا ترقیمہ یہ ہے: تسوید فقیر حقیر ابوالمعالی بتاریخ چہاردہم شہر
جمادی الاول ۱۰۴۳ انجام و انصرام یافت۔

زینت ہے، اس کی تفصیل آتی ہے) ان کی حیات ہی میں ایک بار پھر ان کا دیوان بلکہ کلیات مرتب ہوا جس کی ترتیب پہلے دیوان سے کسی قدر مختلف ہے اور جس کی نمائندگی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے نسخے سے[1] ہوتی ہے، اس آخرالذکر نسخے میں انکی تینوں مثنویاں بھی شامل ہیں،

میر مومن عرشی کی تحریروں سے چند باتوں کا واضح ثبوت ملتا ہے، عرشی اپنی خاندانی وجاہت کا جو حسب و نسب کے امتیاز کے ساتھ علمی امتیاز کا حامل تھا بڑا ذکر کرتا ہے، وہ اپنے باپ کے عرفان اور روحانیت کا مداح تھا، لیکن وہ سب سے زیادہ اپنے بڑے بھائی میر صالح کشفی (فوت ۱۰۶۰) کا مداح تھا جن کے زیر سایہ اس کی تربیت ہوئی تھی، ذیل میں میر مومن کے سوانح کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) **خانوادہ** : جیسا عرض ہو چکا ہے میر مومن عرشی ایک بڑے علمی و مقدس خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، چنانچہ خود اس نے اپنے کلام میں اسکی تفصیل پیش کی ہے ایک قصیدے میں لکھتا ہے :

چہرہ افروز سخن شد تا دل و دانای من — می درخشد آفتاب معنی از سیمای من

از بزرگی می نگنجم در جہان زین طرفہ تر — باچنان حالت بود دل منزل و ماوای من

غلغل اندر ساحت چرخ برین انداختہ — شعلہ افروز محبت مستی صہبای من

سرفرازم در جہان مانند خورشید فلک — کامد از دریای حیدر گوہر والای من

[1] فہرست مخطوطات فارسی، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ مرتبہ ایوانف، مخطوطہ شمارہ ۷۹۱، ۷۹۲، بھی ایک دوسرا مختصر مخطوطہ اسی شاعر کا ہے، یہ شاعر کی زندگی میں ۱۰۶۲ھ کا لکھا ہوا ہے۔

زان ولایت گشت تسخیرم کہ از روز ازل — نعمت اللہ[1] ولی شد جد و از آبای من

نسبتم با زندہ پیل[2] و شاہ طیب[3] نیز ہست — فخر دارد زین سبب این جان غم فرسای من

بسکہ کلک معنی افشاں می نگارد نقش دل — می سزد در دل بگیری گر تو سرتاپای من

خط من یاد از خط مشکین میرم[4] می دہد — از ان شدہ آئینہ چشم جہاں پیمای من

(دیوان سالار جنگ ؛ ورق ۱۲۵)

مثنوی شاہد عرشی (نسخہ علی گڑھ) میں عرشی اپنے چار سالہ بیٹے محمد عارف کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتا ہے :

چون محمد عارف آمد نام تو — از می عرفان شود پر جام تو

ای پسر آبا و اجداد ترا — از ازل آمد ہمین شیوہ سزا

شاہ نور الدین ولی عالی جناب — نعمت اللہ بود ہمچون آفتاب

[1] نسخہ مہر و وفا میں شاہ نعمت اللہ کا ذکر ہے، دیکھئے فہرست مخطوطات، مخطوطہ ۷۹۱۔ شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی ۷۳۰ میں پیدا ہوئے ۸۳۴ میں وفات پائی، مزار کرمان کے قصبہ ماہان میں ہے، ہندوستان کے بہمنی بادشاہ ان کے عقیدتمند تھے، احمد شاہ بہمنی (۸۲۵ - ۸۳۹) کے دور میں ان کے دو صاحبزادے شاہ خلیل اللہ اور شاہ محب اللہ دکن آئے تھے، شاہ نعمت اللہ کا ضخیم فارسی دیوان زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے [2] ژندہ پیل سے مراد احمد جام ژندہ پیل ہیں، تاریخ وفات ۵۳۶ھ، متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، [3] شاہ طیب ہرات میں مدفون ہیں وہ چار واسطوں سے عرشی کی والدہ کے جد تھے، وہ صوفی کے علاوہ شاعر بھی تھے چند شعر کشفی کی مناقب مرتضوی میں درج ہیں، دیکھئے راقم کا مقالہ میر صالح کشفی ص ۲ - ۳ [4] یعنی میرم، اشارہ ہے میر عبد اللہ مشکیں قلم کی طرف، کشفی نے وفات پر جو قطعہ لکھا ہے "میرم" کا لفظ اپنے باپ کیلئے استعمال کیا ہے۔

روز و شب رو سوی قبلہ داشتی — در دل خود تخم تقوی کاشتی

مظہر الآثار[1] سید ہاشمی — گر بخوانی واقف از حالش شوی

وآن دگر سید کہ جدت آمدہ — موبمویش طیب و طاہر شدہ

شاہ طیب نام پاک او بود — از فیوضش جان و دل زندہ شود

استقامت داشت اندر فقر و دین — ہمچو قطبی بود بر روی زمین

در ہرات آسودہ آن پیر زمان — روضۂ او فیض بخش انس و جان (ورق ۷۰-۱)

گویا اس مشہور خانوادے کی چار مشہور و معروف شخصیات ہیں؛ اول احمد جام ژندہ پیل وفات ۵۳۶ھ، شاہ نعمت اللہ ولی (وفات ۸۳۴ھ) شاہ طیب (سنہ وفات معلوم نہیں، کشفی کے بقول اس کی ماں کی طرف سے چار واسطے کے جد ہیں) اور سید ہاشمی کرمانی وفات ۹۴۷ھ۔

۲۔ **عرشی کے والد ماجد:** میر مومن عرشی کے والد میر عبد اللہ حسینی ترمذی ملقب بہ مشکیں قلم ہیں؛ وہ عہد جہانگیر کے ایک نامور شاعر، خطاط اور عارف تھے، خطاطی میں ان کے اپنے دور میں کوئی ان کا نظیر نہ تھا، مشکیں قلم کے خطاب سے سرفراز ہوئے، ان کے خطاطی کے کافی نمونے ملتے ہیں، بالٹی مور (امریکا) کے میوزیم میں ان کے خط میں دیوان حسن سجزی موجود ہے جس پر ان کی تصویر بھی ہے یہ عکس W.E.Begley: Monumental Islamic calligraphy, U.S.A. 1985, cat-P.7 میں چھپا ہے،

---

[1] شاہ جہانگیر ہاشمی ایران حسن ارغون (۹۲۸-۹۶۲ھ) کے عہد میں سندھ آئے اور ۹۴۴ھ میں یہیں بادشاہ کے نام پر مثنوی مظہر الآثار لکھی، باپ کی طرف سے ان کا رشتہ قاسم انوار تک، اور ماں کی طرف سے شاہ نعمت اللہ کرمانی تک پہنچتا ہے، دیکھئے مقالات الشعرا ص ۸۴۴، نیز میرا مقالہ۔ میر صالح کشفی، مجلہ علوم اسلامیہ ص ۵۔

وہ صاحب دیوان شاعر تھے، لیکن دیوان نہیں ملتا، البتہ خمسہ کے جواب میں انکی جو پانچ مثنویاں تھیں ان میں صرف گلشن اسرار بجواب مخزن الاسرار سالار جنگ میوزیم میں (فہرست ج ۵ شمارہ ۱۸۴۳) موجود ہے) ان کا تخلص[1] صفی تھا، وہ چشتیہ سلسلے سے منسلک تھے، شاہ فیض اللہ[2] سہارنپوری کے مرید تھے، ان کے رشد وہدایت کا سلسلہ جاری تھا اور ان کے وابستگان میں ذخیرۃ الخوانین کے مصنف شیخ فرید بھکری اور ان کے والد[3] بھی تھے۔

میر عبد اللہ کے بیٹے میر صالح کشفی نے جو کتبے ان کی وفات پر لکھے ہیں اور جو ان کے مزار کی عمارت کی اندرونی دیواروں پر ثبت ہیں ان سے میر عبد اللہ کے عرفان کا حال کھلتا ہے، دو کتبے وفات کے ہیں اور ایک تاریخ روضہ کا، پہلے[4] دونوں

---

[1] دیکھئے منتخب التواریخ ج ۳ ذیل مادہ وصفی [2] مراۃ العالم ج ۲ ص ۳۸۳ میں انکو شیخ نظام نارنولی کا خلیفہ بتایا ہے انکو انکے ہمنام اور ہم وطن سے جو ۱۶۱۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۰۰ء میں وفات پائی، الگ سمجھنا چاہیئے آخر الذکر پر ایک مقالہ معارف ستمبر ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا ہے، چند اشعار پیر کی مدح میں اس طرح کے ہیں:

منکہ سخن می کنم از پیر خویش — میدہم آرائش تقریر خویش

شیخ ابو الفیض کہ فیض اللہ است — پیکر او جان و دل آگاہ است

مسکن او گرچہ سہارنپور است — لیک مقامش بہ فلک خور است (مثنوی گلشن اسرار: ورق ۳۰)

[3] انکے علاوہ اکبر کا سفرچی تاتار خاں بھی ان کے مریدین میں تھا (دیکھئے مقالہ ڈیسائی معارف اپریل ۱۹۹۱ء) [4] یہ کتبے کئی بار چھپ چکے ہیں؛ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال روداد ۱۸۷۴ء، تذکرہ مشاہیر اکبر آباد تالیف سعید احمد مارہروی (۱۹۳۱ء)؛ مقالہ ڈیسائی معارف اپریل ۱۹۹۱ء، مقالہ بندہ "میر صالح کشفی"، مجلہ علوم اسلامیہ ج ۱۶ شمارہ ۱-۲، ص ۱۰-۱۱۔

کتبے اس طرح پر ہیں :

نیم غمگیں ازین معنی کہ میرم ازین دار فنا سوی جناں رفت

بحمد اللہ کہ عرفان کرد حاصل نہ پنداری زگیتی رایگان رفت

چو تاریخ وفاتش جستم از دل ازین ماتم فغان در آسمان رفت

دلم گفتا بصد درد و بصد آہ ز دنیای دنی قطب زمان رفت

شیخ زمانہ مظہر انوار جاودان کز خواجگان چشت بگیتی نشانہ بود

دریای جود مکان سخا قطب وقت میر عبد اللہ آنکہ ہمہ فنہا یگانہ بود

کشفی سوال کرد ز تاریخ رحلتش ہم خود جواب داد کہ شیخ زمانہ بود

میر مومن نے شاہد عرشی ورق (۶۶-۶۷) میں ایک عنوان کے تحت ان کی زوردار انداز میں ستایش کی ہے :

در مدح حضرت ولایت دستگاہ مرشد خدا آگاہ میر عبد اللہ سلام اللہ علیہ

آن شہنشاہ جہان معنوی آفتاب آسمان معنوی

روشن از نور رخش خورشید جان زمزمہ سنج طلب ناہید جان

گلشن دل فیضیاب از ذات او مست ساز عارفان آیات او

گوہر بحر لطیف مصطفیٰ جوہر پاکش ز کان مصطفیٰ

شاہباز معرفت جانش بود برتر از وہم و خرد شانش بود

شوق افزای جہان گفتار او مست ساز عاشقان دیدار او

عامل علم طریقت بودہ است گلشن بحر حقیقت بودہ است

مو بمویش مست جام ذوق و حال جلوہ گر بودہ است بر تخت کمال

نقطۂ کز کلک او پیدا شدہ چشم جان را مردم بینا شدہ

صفحہ اش روشن تر از رخسار مہ نور بخش چشم چون دیدار مہ

دست گوہر ریز او گاہ رقم ریختی بر صفحہ گوہر از قلم

قامت کلکش چو خط دلبران گاہ جنبش ناز او گشتی عیان

بسکہ شیرین خط از کلکش شد پدید کلک او چون نیشکر شیرین رسید

کلک او طوبی است و دست او جنان وصف طوبی و جنان بشنو عیان

ملک خط را بود او صاحبقران خوش نویسان دگر محکوم آن

سکۂ شاہان است گر بر سیم و زند سکہ زد بر کاغذ آن صاحب ہنر

صفحۂ او سادہ رو چون گلرخان کاندرو نبود ز مشک خود نشان

چون ز خط سطری و صفحۂ می کشید گوئیا خط بر رخ سادہ شنید

خط ہمان بہتر کہ باشد بی تراش کز تراش خط رسد دل را خراش

چون تراشی خط و خط گلرخان آن نمک نبود درو بنگر عیان

از مداد ش گوہر روشن خوشاب می شود ظاہر چو از شب آفتاب

جانشین احمد مختار او ست ہمنشین حیدر کرار او ست

میر عبد اللہ نام پاک او ست یاد نامش میر ساند ما بدوست

یاد نامش سر بسر جان می کند پای تا سر بوستان می کند

یاد نامش پاک سازد اندرون محو سازد اندرون نقش برون

یاد نامش خضر راہ اولیا نام او شد ورد نام اتقیا

نام او بر روح دل بنگاشتم پس لوای معرفت افراشتم

نام او افروخت نوری در دلم   کز فروغش گشتہ روشن محفلم

ذات او آئینہ مطلق بود   ذات او شمش جہت عاشق بود

ہر کہ گشتہ ذات او را دوستدار   شاہد دل را کشیدہ در کنار

تا کہ ذات او بہ دون زین محفل است   گوہر دل را نہفتہ در گل است

روضۂ او فیض بخش انس و جان است   خاک پایش سرمۂ اہل جہانست

نیر توحید شد روشن از و   دفتر طبع شدہ گلشن از و

چون بمدحش طبع من در بار گشت   آشکارا شاہد اسرار گشت

مست یاد او بود عرشی مدام   نام پاکش ورد کردہ صبح و شام

میر عبداللہ کی پیدائش[1] ۹۷۰ میں ہوئی ہوگی، گویا وفات ۱۰۳۵ میں وہ ۶۵ سال کے تھے۔ بقول بدایونی[2] میر شیخ عنایت اور مولانا نارائمی کے شاگرد تھے اور ان کا شمار احدیوں میں ہوتا تھا۔ ماں کی طرف سے ان کا رشتہ نظام الدین احمد صاحب طبقات اکبری سے ملتا ہے۔ ان کا مزار آگرے میں باقی ہے، یہ مزار جمنا سے سکندرہ کو جو بائی پاس ہے اس کے کنارے پورب دکھن طرف محلہ جواہر نگلا میں (تلسی سنیما کے کچھ پہلے قندھاری چوراہے کے نزدیک) ایک چھوٹی سی پرانی عمارت میں ہے، اسی عمارت کی اندرونی دیواروں پر کتبے موجود ہیں۔

---

[1] میر مومن عرشی کی وفات ۹۰ سال کی عمر میں ۱۰۹۱ھ میں ہوئی اسلیے پیدائش کی تاریخ ۱۰۰۱ھ قرار پاتی ہے۔ میر عبداللہ نے میر مومن کو ۴ سال کی عمر میں نصیحت کی تھی یعنی ۱۰۰۵ھ میں۔ اسوقت انکی عمر ۳۵ سال کی تھی اس لحاظ سے میر عبداللہ کی تاریخ پیدائش ۱۰۰۵-۳۵ = ۹۷۰ قرار پاتی ہے۔ [2] منتخب التواریخ ج ۳ ذیل ما ۵۵ وصفی (مشاعران دربار اکبری)

۳۔ میر مومن کی ولادت و وفات: مرآۃ العالم (ج ۲ ص ۴۸۵) اور صبح گلشن (ص ۲۷۹) سے معلوم ہوا کہ میر مومن عرشی نے نوے سال کی عمر میں ۱۰۹۱ میں وفات پائی، اس لحاظ سے ان کی ولادت کی تاریخ ۱۰۰۱ھ قرار پاتی ہے، اس کی تاریخ وفات پر مخبر الواصلین[1] میں دو قطعے ہیں جن سے ۱۰۹۱ ہجری نکلتی ہے وہ قطعے یہ ہیں:

زہے مقتدای زمان میر مومن   بخوبی گذشت از جہان میر مومن

بہ دین و بہ اسلام و ایمان و عرفان   بحق کرد تسلیم جان میر مومن

بہ ماہی کہ رفت از جہان سرور دین   گذشتہ ازین خاکدان میر مومن

شب پنجشنبہ بتاریخ "زبدہ"   روان شد بقصر جنان میر مومن

چو پرسید سال وصالش محبان   بگو سید عرشیان میر مومن

میر مومن سید عرفان پناہ   چون زدنیا رفت سوی خلد آہ

سال نقلش از زمان عرشیان   گو ولی از دور عالم رفت آہ

مرآۃ العالم (۲ = ۴۸۵) میں سید عرشیاں میر مومن کی تاریخ وفات بتائی گئی ہے۔

۴۔ میر مومن کے برادر بزرگ میر صالح کشفی: میر صالح کشفی میر مومن کے بڑے بھائی اور مربی بھی تھے، میر مومن کی تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ ہے چنانچہ عرشی نے اپنے کلام میں کئی جگہ اپنی ارادت کا ذکر کیا ہے، ذیل میں دو ایک جگہ کے اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

مدح گویم برادر خود را   کہ مرا قبلۂ روان باشد

میر صالح کہ ہمچو ماہ منیر   پرتو او فروغ جان باشد

---

[1] مطبوعہ کتابخانہ نذیریہ دہلی ص ۱۳۰، مخبر الواصلین کا جو نسخہ سالار جنگ میوزیم میں ہے وہ ۱۰۶۶ پر تمام ہو جاتا ہے اس میں کشفی کی تاریخ وفات ۱۰۶۶ کا قطعہ ہے مگر عرشی کی تاریخ وفات نہیں ہے۔

یا چو در لالہ رنگ و بو در گل نور در دیدہ ام عیان باشد

ہر کجا تو بحال بنشینی بر سرت ماہ سائبان باشد

از گران باری تو در عالم کوہ را پلہ گران باشد

از سبک روحیت نسیم صبا در چمن ہر طرف روان باشد

بہ فضیلت بہار علمی تو علم تو علم خاندان باشد

تو مرا مرشدی و رشدی از تست از تو رشدی بہ راشدان باشد

تو قریبی بدل ز لطف طبع قرب تو باشہ جہان باشد

سرورا قبلہ گاہ جان منی دل من ہمچو زائران باشد

بہ تکلف سخن نمی گویم کہ تکلف ز من نہان باشد

من سخنگو نہ گفتمت زانرو کہ سخن فہم بہ ازان باشد

ورنہ در ہر فنی تو استادی اوستادی ترا نشان باشد

کن تامل بہ نظم کز لطفت انوری را چنین بیان باشد

تو بانصاف سوی من بنگر کہ مرا دستگاہ جان باشد

تو دعا کن کہ از دعای تو نام من در جہانیان باشد

اندرین عالم نفاق و حسد جز برادر کہ مہربان باشد

من ترا دادم و خدا را بس این سخنہا برای آن باشد

آنچہ از من بود کنم در پیش آنچہ تو داری از من آن باشد

ماہ از مہر نور می خواہد مہر بہ ماہ مہربان باشد

من از آن تو شدم تو از من باش کہ مرا فتنہا ازان باشد

(دیوان نسخہ سالار جنگ میوزیم ورق ۱۳۵ ببعد)

شاہد عرشی (ورق ۶۸) میں لکھا ہے:

در مدح حضرت قدوة العاشقین میر محمد صالح سلام اللہ علیہ

ای دل از جوشش محبت دل کشا لفظ کن آئینہ معنی نما

روی او آئینہ نور آمدہ مو بمو از فیض معمور آمدہ

پای تا سر گنج درد و سوز ہست شمع غم را روشنی افروز ہست

درد او گر بر سر کوہی فتد کوہ ہمچو ذرہ ہا از جا جہد

گر ز اشکش بحر را لب تر شود موج او از نہ فلک برتر شود

گر ز سوز او خبر یابد جہان آتش افتد یکسرہ در انس و جان

آہ او از سینہ گر بیرون شود عرش و کرسی را جگر پر خون شود

تا بود جان در تنم عالم عیان ذات پاکش باد زندہ ہمچو جان

اسی سلسلے میں ظہور تصرف ولایت کے ذیل میں لکھا ہے: (ورق ۶۸ ب)

پیر من خورشید عرفان آمدہ پای تا سر یوسفستان آمدہ

بود مقبول محمدؐ مصطفیٰ از رہ صدق دل و جان مرتضیٰ

بسکہ اندر عشق حیدر مست شد ہمچو جوش عاشقی از دست شد

ہستی او محو شد در مرتضیٰ مرتضیٰ را جانشین آمد سزا

کور دل از ذات او واقف کجاست ذات او را سیر اندر کبریاست

خارجی با مرتضیٰ نیکو نشد سوی قبلہ کافران را رو نشد

چون تواند میر صالح را شناخت خارجی کو بحیدر کج بباخت

میر صالح خضر راہ عاشقانست شاہدان معنوی را ہمزبانست

میرصالح شاہ اقلیم بطون است
واقف اسرار بیرون و درون است

میرصالح چشمۂ عرفان بود
نوبہار گلشن ایمان بود

میرصالح واصل حق آمدہ
سیر او بر اوج مطلق آمدہ

میرصالح عارف و ہم عاشق است
عارف و ہم عاشق و ہم صادق است

میرصالح ساخت زندہ جان و دل
کردہ دلہا را برون از آب و گل

انجمن از سایہ او روشن است
سایۂ اش چشم جہان را گلشن است

بزم جان از پرتوش روشن بود
از بہار فیض او گلشن بود

چشم او بینندۂ سیمای فیض
جوش زن از جان او دریای فیض

جان او گر فیض افشانی کند
مردہ دل از فیض او زندہ شود

میرصالح کشفی شاہجہاں کے زمانے میں نہ صدی ذات صد سوار منصبدار تھے اور ۱۰۶۰ھ میں بادشاہ کے ۲۳ویں سال جلوس داروغۂ کتابخانہ مقرر ہوئے، (شاہجہان نامہ ۳ : ۸۳) اور ایک ہی سال کے اندر ۵ شعبان ۱۰۶۰ میں وفات پاگئے، (ایضاً ۳ : ۸۶) مخزن الواصلین (ص ۸۹) میں ان کی وفات کی تین تاریخیں لکھی گئیں:

میرصالح کہ اہل عرفان بود
صاحب کشف راز یزدان بود

دُر دریای مصطفےٰ بودہ
گل گلزار مرتضےٰ بودہ

ذات پاکش کہ از حق آگاہست
لمعۂ نور نعمت اللہ ست

عقل تاریخ آن ستودہ نژاد
گفت کشفی بخلد آب بداد

باز سال وصال آن خوش بو
وا لی خلد میر صالح گو

سال شنقار صالح دوران
شد رقم شاہ یا زخلد وجان

مدفن او بہ اکبر آباد است
روحش از فیض ایزدی شاد است

(نسخۂ مطبوعہ ص ۸۹)

میرصالح علاوہ تصوف وعرفان کے ایک خوش فکر شاعر اور ادیب اور بڑے درجے کے خطاط تھے، ان کی ایک ضخیم نثری تصنیف مناقب مرتضوی نہایت مقبول کتاب ہے جسکے متعدد نسخے ملتے ہیں، علاوہ بریں وہ زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔ راقم حروف نے اپنے مقالے میں اس کتاب پر سیر حاصل بحث کی ہے، انکی شاعری کا دیوان نہیں ملتا لیکن کافی اشعار مناقب مرتضوی میں نقل ہیں۔ مناقب مرتضوی سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ علوم اسلامی کے ذخائر پر میر صالح کیسی دقیق نظر رکھتے تھے، اس کتاب کے ماخذ میں شاید اسلامی علوم کی سیکڑوں ہزاروں کتابیں ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی، فارسی کے علاوہ عربی زبان پر بڑی قدرت رکھتا تھا، مناقب مرتضوی میں عربی عبارت کا ترجمہ سلیس فارسی میں خود مصنف کے قلم کی یادگار ہے۔ اس کا ایک مشہور ترجیع بند بنام مجموعۂ راز سعدی شیرازی کے شہرۂ آفاق ترجیع بند کے جواب میں موجود ہے جو زیور طبع سے آراستہ بھی ہو چکا ہے۔ مناقب مرتضوی ۱۰۴۴ میں شروع ہوئی اور ۱۰۳۶ میں مکمل ہوئی، مہدی آخر الزمان تاریخ آغاز (۱۰۳۴) اور تاریخ اختتام راہنمای خلق (۱۰۳۶) ہے۔

میرصالح نے اعجاز مصطفوی[1] اور مناقب اصحاب پیغمبر دو کتابوں[2] کے لکھنے کا

---

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسکو شروع کر دیا تھا، مگر ختم نہ کر سکے، اسکی تکمیل کا سہرا عرشی کے پوتے میر عبداللہ پسر میر ہاشم نعمت اللہی کے سر ہے اسکا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے (مقالہ ڈیسائی، رسالہ معارف اپریل ۱۹۹۱ء)

[2] مناقب مرتضوی ورق ۲۶۹ ب، ۳۰۸ نیز دیکھئے مجلہ علوم اسلامیہ ج ۱۶ شمارہ ۱-۲ ص ۲۹۔

عہد کیا تھا، مگر بظاہر ان میں کوئی وہ نہ لکھ سکے۔

میر صالح[1] ٹھٹھہ کے شاعر تھے اور سبحان تخلص کرتے تھے۔

میر صالح نے ایک مثنوی، مثنوی قدسی کے نام سے لکھی تھی، اس کی تفصیل معلوم نہیں؛ البتہ اس کے جستہ جستہ اشعار مناقب مرتضوی[2] میں نقل ہیں، یہ عارفانہ مثنوی تھی اور مثنوی معنوی کی بحر میں تھی۔

میر مومن عرشی کے دوسرے ا،۰ہ میں ایک ان کے بیٹے محمد عارف اور دوسرے ان کے پھوپھازاد بھائی میر محمد شریف اور تیسرے ان کے پوتے میر عبداللہ پسر میر ہاشم کے نام ملتے ہیں۔ شریف اچھا خطاط تھا، خط نستعلیق میں اس نے مہارت حاصل کی تھی، مراۃ العالم (۲ : ۴۸۵) میں ہے کہ جہانگیر نے اس کو کاتب السلطانی کا خطاب دیا، کہتے ہیں کہ عرشی کے والد میر عبدالحیٔ ترمذی نے اپنے بھانجے کی پرورش کی تھی اور مرتے وقت اس کو اپنا جانشین بنایا تھا، مگر باوجود کمال فن کے وہ گمنامی میں زندگی بسر کرتا، ۱۰۵۴ھ میں وفات پائی، عرشی نے ایک قطعۂ تاریخ لکھا

خوشنویس زمانہ میر شریف	کہ بذات شریف اشرف بود
سال فوتش چو از خرد جستم	گفت دانش کہ خوشنویسی بود (۱۰۵۴)

۵۔ میر مومن عرشی کا بیٹا محمد عارف : محمد عارف عرشی کا بیٹا تھا، مثنوی شاہد عرشی (ورق ۱۷۶) میں اس کی عمر ۴ سال کی بتائی گئی ہے[3]، اس مثنوی کی تاریخ تصنیف ۱۰۶۹ھ بتائی گئی ہے، اس حساب سے عارف کی تاریخ پیدائش ۱۰۶۵ھ

---

[1] یہ اطلاع عمل صالح (شاہ جہان نامہ) جلد ۳ ص ۴۴۳ سے ملی۔ [2] دیکھیے مجلہ علوم اسلامیہ ج ۱۶ شمارہ ۱، ۲ ص ۲۳ بعد [3] دیوان نسخۂ سالار جنگ ورق ۱۷۶۔

ہوتی ہے، اس تاریخ میں عرشی کی عمر ۴۶ سال کی ہوتی ہے، یہ اطلاع دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ عرشی کے والد میر عبداللہ مشکیں قلم ترمذی نے اپنے بیٹے میر مومن کو ۴ سال کی عمر میں نصیحت کی تھی، چار ہی سال کی عمر میں میر مومن نے اپنے بیٹے کے لیے وصیت نامہ درست کیا، یہ وصیت نامہ میر عبداللہ مشکیں قلم ترمذی متخلص بہ وصفی کی وصیت مثنوی گلشن اسرار (نسخہ سالار جنگ میوزیم) میں محفوظ ہے، اسکے چند اشعار[1] یہ ہیں:

مقالہ چہاردہم در نصیحت فرزند ارجمند

ای ز تو روشن سحر جان من	وای تو گلدستۂ بستان من
چشم مرا از تو ضیای حیات	جان مرا از تو بقای حیات
دل ز تو خوش دل چو طلب از مراد	سال تو چار است ز صد بیش باد
ہست محمد مومن نام تو	باد بخیر اول و انجام تو
باد نصیبت دل چون آفتاب	موی بموی تو ز حق کامیاب
مظہرت آئینہ عرفان سواد	گوہرت آرایش ایمان سواد
مہر تو از کلک، عطارد اثر	ریختم از بحر نصیحت گہر
گرچہ کنون درخور فہم تو نیست	رفعت این درخور ہم تو نیست
ہست امیدم کہ پس از چند سال	نیک بفہمی سخن اہل حال
روز نخستین ادب آموز شو	وز ادب خویش دل افروز شو
ہمچو الف قامت خود راست کن	وانگہ از استاد سبق یاد کن
چون سبقت گفت الف اوستاد	خاطر خود راز الف داد و شاد

---

[1] گلشن اسرار مخطوطہ، ۱۸۴، مقالہ چہاردہم ورق ۸۰ - ۸۲۔

ذکر اللہ تقدری کن کہ جان   ہمچو الف راست نماید عیان
باش نہان از نظر خاص و عام   ہمچو الف باد مجرد مدام
چون سبق خویش مہیا کنی   چہرہ فرہنگ تماشا کنی

یہی مومن بڑے ہو کر عرشی ہوئے اور اپنے چار سالہ بیٹے محمد عارف کو اسی طرح کی نصیحت کی جیسی ان کو انکے باپ نے کی تھی۔ اس سلسلے کے اشعار[۱] ملاحظہ ہوں:

ای کہ ہستی گوہر مقصود من   صیقل آئینۂ بہبود من
دیدن رویت مرا باغ و بہار   حرف شیرین تو ام شکّر نثار
خوش دلم از دیدن رویت کنون   سال تو چار است بادا صد فزون
چون محمد عارف آمد نام تو   از می عرفان شود پُر جام تو
چشم جانت باد بر دل دوختہ   ہم دلت از نور جان افروختہ
دل درون سینہ ات روشن شود   عالم از فیض دلت روشن شود
آنچنان در یاد حق باشی فرو   تا ترا ورد نام حق از مو بمو
باش دایم با طہارت ای پسر   تا کنی بر شاہد پاکی نظر
جہد کن تا علم آموزی ز جہد   خویش را چون مہر اندوزی ز جہد
آدم بی علم دیوار آمدہ   در گلستان جہان خار آمدہ
آدم بی علم حیوانی بود   خود بخود بر خویش نادانی بود
گر تو علم شرع و دین آموختی   دیدہ بر علم لدنی دوختی
علم معنی گر شود حاصل ترا   می شود مکشوف سرّ کبریا

---

[۱] ورق ۷۰، و-۷۱ ب۔

باش بر راہ شریعت مستقیم   تا رہی از ورطۂ امید و بیم
از شریعت چون کنی دل را نشان   در طریقت راہ یابی بی گمان
راہ شرع ست آنکہ باشی باوضو   تا شوی پروردۂ جان مو بمو
باوضو گر خو کنی ای جان من   زندہ گردد دل ز فیض ذوالمنن
چو سلاح المومنین گفتہ نبیؐ   ہر کہ پوشیدہ شدہ نامش ولی
پر حذر باشد ز شر دشمنان   زین سلاح از شرشان یابی امان
قوت خود را ساز از کسب حلال   تا دلت نوشد شراب ذوق و حال
از کتابت گر تو قوت خود کنی   مرتضیٰ را کردہ باشی پیروی
لقمۂ کز کسب پاک خود خوری   بر دل خود تحفۂ نوری بری

اس کے بعد اپنے اجداد کا ذکر کرتا ہے، چند اشعار[۱] ملاحظہ ہوں:

در شریعت گر قدم محکم زنی   از طریقت می توانی دم زنی
در طریقت چون نہادی کام دل   ساختی دل را برون از آب و گل
پیر بگزین تا نماید رہ ترا   سازد از راز خدا آگہ ترا
پیر بگزین تا شود فیض بہار   جلوہ گر بینی بہر سو زیب زار
پیر بگزین تا نماید نور روح   بحر گردد تا لبت قلب تو نوح
پیر بگزین تا شوی خورشید جان   نغمہ آرائی کند ناہید جان
پیر بگزین تا بنوشی جام ذوق   مست گردی چون بگیری نام ذوق
پیر بگزین لیک پیری آنچنان   کہ دلش باشد سراپا محو جان

---

[۱] ورق ۱، ب۔

موبمویش لب بذکر حق بود   سیر او در عالم مطلق بود

موبمویش چون زبان گویا شود   نام حق بر هر لب مویش بود

عارفی کوز خدا دارد خبر   کی بهذیان لب کشاید ای پسر

مرد را در کام تیغ آمد زبان   تیغ اگر جنبد بریزد خون جان

تیغ می باید که باشد در نیام   گر بجنبد خون چکد از خاص و عام

میر مومن عرشی کے ایک پوتے میر عبداللہ پسر میر ہاشم نعمت اللہی الحسینی کا نام ملتا ہے، وہ شاعر تھا اور واصفی تخلص تھا، واصفی نے میر صالح کشفی کی ناتمام کتاب اعجاز مصطفوی کو، ۱۱۰۵ھ میں مکمل کیا، اس کا ایک نسخہ[1] برٹش میوزیم میں ہے، یہ ضخیم تالیف ہے جو ڈیڑھ سال کے وقفے میں اختتام کو پہنچی۔

۶۔ عرشی کی فضیلت: میر مومن عرشی کی فضیلت شاعری اور خطاطی کے اعتبار سے بھی، چنانچہ اس نے انہیں دونوں فضیلتوں کا کئی بار ذکر کیا ہے، شاہجہان کے نام کے ایک مدحیہ[2] قصیدہ میں عرشی کہتا ہے:

شنیده ام که براه عنایت و الطاف   زبنده که دعاگوی اوست کرده یاد

ازین خبر دل عرشی شگفته شد چون گل   در بهشت طرب را بروی خود بکشاد

۱؎ فہرست مخطوطات فارسی ۱: ۱۵۳-۱۵۴، یہ کتاب ۴۲۳ اوراق پر مشتمل ہے اور خراسان کے ایک حاکم کے نام پر لکھی گئی، اس کے اجزا یہ ہیں:

دیباچہ از میر عبداللہ نظم میں، تخلیق عالم، سیرت رسول صلعم، معجزات رسول اللہ، حجۃ الوداع، وفات، خلفای راشدین، شمائل رسول اللہ، مرثیہ بر وفات آن سرور، حضرت فاطمہ، دوازدہ امام۔

۲؎ دیوان مخطوطہ سالار جنگ میوزیم شمارہ ۱۹۵۵، ورق ۱۳۱۔

جواهر سخن از طبع او گرفته رنگ   ز فیض مدح تو افروخت جوهر استعداد

بزرگوارا شاهنشها فلک قدرا   که پای قدر تو بر بام چرخ پایه نهاد

رسند اهل هنر پیش من بشاگردی   منم در عهد تو در فن شعر و خط استاد

بهار گلشن نظمم ولی فرو برده   چو غنچه سر بگریبان شرم از اجداد

به شعر شهره نگشتم اگرچه این فن را   نهاده ام به طبیعت بر آسمان بنیاد

چو آفتاب خطوط شعاع بر گردون   بروی صفحه کشیدم خط از سواد و مداد

فلک ندیده بدینسان سواد تو دانی   که کلک من ز سواد و مداد کرد ایجاد

ز کلک من که جواهر به سلک او باشد   بمدح تو همه گوهر بروی صفحه فتاد

پری و حور بود شعر و خط بصد زینت   به بزم شاه روان ساختم ز راه وداد

بجلوه آمد از کلک من به صفحهٔ حسن   هزار رنگ پری زادگان حور نژاد

چو دام سلسلهٔ مدح شاه گستردم   هزار طایر معنی مرا بدام فتاد

بظاهر ارچه که دورم بخدمتت لیکن   برادرم که مرا مرشد است و هم استاد

نشسته بود چو قطب فلک بروی زمین   اسیر خلق تو گشت و به پیش تو استاد

بزرگ صورت و معنی است میر صالح ازان   همیشه لطف شهنشاه سایه گستر باد

ز حکم تو به سلیمان[1] شکوه والا قدر   دگر از لطف تو چون پدر رسد بمراد

زبان فرس و فنون خطوط و انشا را   بسعی وافر و از فیض طبع یادم داد

۱؎ صبح گلشن ص ۲۷۹ سے معلوم ہوا کہ داراشکوہ نے اپنے نور نظر سلیمان شکوہ کو حسن خط کی تعلیم کے لیے عرشی کو مقرر کیا تھا۔ سلیمان شکوہ ۱۰۷۲ھ میں تیس سال کی عمر میں فوت ہوا (عمل صالح ج ۳ ص ۲۴۳)

ایک قطعہ[1] میں پھر اپنی شاعری اور خطاطی پر فخر کرتا ہے :

بی مربی خط نستعلیق خود آراستم　　　می سزد گر چرخ بر من آفرین ریزد مدام

ماہ کز وی ہر شبی روشن شود بزم فلک　　　نور از خورشید گیرد تا شود بدر تمام

آفتاب فطرت انوارم بہ گردون ہم　　　روشنم از نور خود دارم بعالم احترام

خوشنویس قطعہ آرایم بخط خوش اصول　　　شاعر مستغنیم عرشی تخلص خوش کلام

نیستم محتاج این دو شہان زر پرست　　　روزی از خوان کسب خویشتن دارم بکام

ای کہ ‌[2] از حسن خط جہانگیری　　　وی کہ در علم و فضل بی بدلی

تا ز خطت سواد خوان شدہ ام　　　واقفم از خط خفی و جلی

آنچہ من دیدم از خط مشکیں　　　کس ندیدہ ز خط میر علی

ایک مشہور ترجیع[3] کے ایک بند میں اپنی شاعری اور خط پر فخر کرتا ہے :

در علم خطوط بی نظیرم　　　و اندر فن شاعری ظہیرم

از کج روشی گر ہنر پایم　　　در راست روی بسان تیرم

آیینۂ فطرت بلندم　　　خورشید نمی برد نظیرم

در ملک سخن مراست شاہی　　　عالی طبعم بود دبیرم

مثنوی شاہد عرشی میں اپنی شاعری پر اظہار[4] فخر کرتا ہے :

طبع من باغ و گلشن تازہ سخن　　　بلبل این باغ و این گل جان من

عندلیبی ہمچو من در این چمن　　　سالہا باید کہ آید در سخن

سالہا باید کہ جانہا خون شود　　　تا معانی از دلی بیرون شود

---

[1] دیوان ورق ۱۵ اب [2] ایضاً ورق ۲۱ اب [3] ورق ۱۴۷ او [4] ورق ۸۲ - ببعد -

سالہا باید کہ گردد آسمان　　　تا چو عرشی آورد صاحب بیان

تو بگوی مدح سلطان و شہان　　　من بگویم وصف خلاق جہان

تو حدیث گنج قارون می کنی　　　قلب را زین فکر وارون می کنی

من حدیث عیسیٰ و موسیٰ کنم　　　قصہ ہای اہل دل پیدا کنم

من بطرز مولوی گویم سخن　　　تو چہ می گوئی بگو باری زمن

نیستم آن شاعر بیہودہ گو　　　تا بگردم سوی دونان کو بکو

شاعر رحمانیم کز فیض جان　　　گل ہمی ریزم بجیب عارفان

مدح گویم لیک مدح اہل دل　　　دل کنم از مدح شان شمع چگل

عرشی پر فقر و تصوف کا میلان تھا اور یہ اس کا خاندانی ورثہ تھا، صبح گلشن ص ۲۷۹ میں ہے کہ سرکار عالمگیر سے جو اس کو وجہ قلیل ملتا اسی پر اکتفا کرتا اور زاویۂ توکل سے باہر قدم نہیں نکالتا۔ اپنے بزرگوں کے تتبع میں اہل بیت سے بے حد عقیدت رکھتا چنانچہ اس کے بیشتر قصائد اور مثنویات کے اجزا اہل بیت کے لیے وقف ہیں۔

(باقی)

رمز الریاحین پر ایک تعارفی مضمون کا جائزہ

از: ڈاکٹر عبدالرب عرفان

(۲)

اشعار و ابیات پر ایک نظر

مضمون میں اشعار و ابیات نہایت فراوانی مگر بے احتیاطی کے ساتھ نقل کیے گئے ہیں۔ ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مخطوطوں کو صحت کے ساتھ پڑھنے کے عادی نہیں ہیں اسی لیے نقل مطابق اصل کا اصول اپنایا ہے۔ عام طور پر جو مخطوطے اصل سے نقل در نقل تیار کیے گئے ہیں ان میں بکثرت الفاظ کی صورت مسخ ہو گئی ہے۔ ان میں بعض کی مسخ شدہ مکتوبی صورت خود صحیح قرأت کی طرف اشارہ کر دیتی ہے۔ شعور و وجدان کی رہنمائی میں قدرے غور و فکر سے کام لیکر ایسے الفاظ کی تصحیح کی جا سکتی ہے۔

مضمون "رمز الریاحین" کے منقولہ ابیات و اشعار میں بیشتر غلط قرأتوں کے حامل ہیں۔ ان کی ایک معتد بہ تعداد کو تھوڑے سے غور و فکر کے ساتھ درست، "منشائے مصنف" کے قریب تر اور بعض کو پورے اعتماد کے ساتھ "منشائے مصنف" کے عین مطابق کیا جا سکتا ہے۔ سطور ذیل میں ایسے تمام اشعار و ابیات کو زیر تبصرہ مضمون سے بجنسہ نقل کر کے ان کا جائزہ لیا جاتا ہے:

(۱) جد و پدر تراست سال تاریخ ظل اللہ و ظل حق و ظل معبود (ص ۵ ح ۱)

اس شعر کے ساتھ قوسین میں ۹۹۴ھ / ۱۰۳۸ھ / ۱۰۵۲ھ درج ہیں لیکن پہلے مصرعے میں شاہ عباس ثانی کے جد اور پدر (شاہ عباس اول اور شاہ صفی) کا ذکر ہے جن کے سالہائے جلوس "ظل اللہ" اور "ظل حق" سے علی الترتیب ۹۹۴ (؟) اور ۱۰۳۸ھ برآمد کیے گئے ہیں۔ شعر کی موجودہ صورت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ تیسرا مادۂ تاریخ کس کا سال جلوس ہے۔ اگر "پدر" کے بعد ایک واو عطف کا اضافہ کر دیا جائے تو تیسرا مادہ خود شاعر کے مخاطب شاہ عباس ثانی کا سال جلوس قرار پاتا ہے۔ دوسری محل نظریات یہ ہے کہ "ظل اللہ" سے سال ۹۹۴ھ نہیں ۹۹۶ھ برآمد ہوتا ہے۔

(۲) بیا کہ بی تو بدل ہر دم از جہان سنگ است شیشۂ نازک مزاج ما سنگ است (ص ۱۰/س ۲-۳)

پہلا مصرع قافیے سے محروم ہے اور دوسرا وزن سے عاری۔ استفہام کے اظہار کیلیے کوئی علامت (مثلاً کذا یا سوالیہ نشان) بھی موجود نہیں۔ ممکن ہے ڈاکٹر صاحب کی نظر میں یہ شعر درست ہو۔ مصرع اول میں ردیف "سنگ است" سے قبل "جہان ہے" جبکہ غزل کے دیگر قوافی ما، کجا، صفا وغیرہ ہیں، لہذا "جہان" کے بجائے اسی کا ہم وزن الف پر ختم ہونے والا کوئی لفظ (مثلاً غنا) رہا ہوگا۔ دوسرے مصرعے کے شروع میں "حریف" بڑھا دینے سے مصرع موزوں اور اس کا مفہوم واضح اور مکمل ہو جاتا ہے۔

(۳) نیافتم کہ پایان درد ما ز کجاست نیا کوہ کہ دانست تا کجا سنگ است[1] (ص ۱۰/س ۵-۶)

"نیافتیم" کو "نیافتم" لکھنے سے مصرع ناموزوں ہو گیا۔ دوسرے مصرعے میں پہلے لفظ کے دونوں نقطے اپنی اپنی جگہ سے ہٹے ہوئے ہیں (اس قسم کے الفاظ مخطوطوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں، مگر پڑھنے والے درست پڑھ ہی لیتے ہیں) قیاس ہے کہ

[1] معاصرف پہلے مصرعہ میں مضمون نگار کی اور دوسرے میں کاتب کی غلطی ہے۔

اس لفظ کو بے سوچے سمجھے بجنسہ ہی نقل کر لیا گیا ہے۔ صحیح لفظ "بنای" ہے۔ مصرع اس طرح ہے ــــ بنای کوہ کہ دانست تا کجا سنگ است۔

(۴) شکستہ تر شودم دل چو صاف تر گردد بیا کہ پی تو در آئینہ ام صفا سنگ است (ص ۱۰/س ۷-۶)

صرف ایک دو حرفی لفظ کی غلط قرأت سے دوسرے مصرعے کا وزن غارت اور مفہوم خبط ہو گیا۔ حرف نفی "بی" کو ہمزۂ اضافت کے ساتھ "پی" پڑھ کر معنی و مفہوم کو الفاظ کی قید سے رہائی دلا دینا ڈاکٹر صاحب ہی کا حصہ ہے۔ صحیح مصرع ملاحظہ فرمائیں

ع بیا کہ بی تو در آئینہ ام صفا سنگ است۔

(۵) سوار باش حمازۂ جنونِ رمزی کہ زیر پا ہمہ جا خار بیش پا سنگ است (ص ۱۰/س ۱۱-۱۰)

پہلا مصرع ایک حرف "ب" کے کم ہونے سے ناموزوں تو ہوا ہی، جنون کے نون کو کسرۂ اضافت کے ساتھ لکھنے سے مہمل بھی ہو گیا۔ اس کی ذمہ داری کلیتاً ڈاکٹر صاحب پر عائد ہوتی ہے۔ اگر نسخے میں "حمازہ" تھا تو موصوف اسے "سوار باش" کی مناسبت ملحوظ رکھتے ہوئے (ایک "ب" اور ایک نقطے کے اضافے سے) بآسانی "بجمازہ" بنا سکتے تھے۔ شاید اس صورت میں "نون" کو کسرۂ اضافت سے نہ لکھتے اور شعر مزید مسخ نہ ہوتا۔ دوسرے مصرعے میں "خار" کے بعد واو عطف بھی چاہیے۔ درست شعر ملاحظہ فرمائیں:

سوار باش بجمازۂ جنون رمزی کہ زیر پا ہمہ جا خار و بیش پا سنگ است

(۶) حسن تو در پردہ وگشتہ بیاں جلوہ گر از عکس تو دیدار ہا (ص ۱۰/س ۱۷-۱۶)

"گشتہ" بجائے "کشتہ"۔ شعر کا مضمون "بیان" کی جگہ "عیان" کا متقاضی ہے۔

(۷) بشہد شکر شکر خداوند زبان چون مغز بادامست در قند (ص ۱۰/س ۲۰-۱۹)

دونوں شکر کے درمیان "در" چاہیے ورنہ مصرع ناموزوں رہے گا۔ قیاس ہے کہ مصرعے میں پہلے شکر کو "شکر" پڑھا گیا ہے[۱]۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو "شہد شکر" کے درمیان واو عطف لانا ضروری ہے۔ مصرعے کی موخر قرأت ـ بشہد و شکر شکر خداوند۔ مرجح ہے۔

(۸) بفضل حق باصفہان رسیدیم گو گفتی بزمین جنت بدیدیم (ص ۱۳/س ۱۱)

مصرع اول کا وزن "اصفہان" پر ساقط ہو گیا ہے۔ شاعر نے "اصفاہان" باندھا ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب کو اس کی وجہ تسمیہ کا علم ہوتا تو "اصفہان" لکھ کر مصرعے کے وزن میں خلل پیدا نہ کرتے۔ دوسرے مصرعے کا پہلا لفظ "گو" یقیناً "تو" کی تحریف شدہ شکل ہے۔ صحیح شعر جو منشائے مصنف کے عین مطابق ہے، ملاحظہ فرمائیں:

بفضل حق باصفاہان رسیدیم تو گفتی بزمین جنت بدیدیم

(۹) ع گل و سنبل ہر گوشہ کناری (ص ۱۳/س ۱۲)

"بہر گوشہ" بجائے "ہر گوشہ"۔

(۱۰) محمد آبروی آفرینش چراغ افروز در چشم اہل بینش (ص ۱۸/س ۲)

دوسرا مصرع ایک قطعی غیر ضروری لفظ "در" کے بے جا اضافے سے وزن سے خارج ہو گیا۔ صحیح مصرع :- چراغ افروزِ چشمِ اہلِ بینش کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔

(۱۱) شبی مجموعۂ فیض الٰہی منور گشتہ از مہ تابہائی (ص ۱۸/س ۴)

مصرع ثانی کا آخری لفظ "تابہائی" لغو اور بے معنی ہے۔ اگر "ی" پر ہمزہ

---

[۱] معارف "ڈاکٹر صاحب نے دوسرے شکر پر تشدید لکھی تھی جسکو کاتب نے نہیں لکھا۔

نہ ہوتا تو اس کو کاتب کے سر ڈالا جا سکتا تھا۔ اس شعر میں "الہی" اور "مہ" ایسے الفاظ ہیں جو اس غلط لفظ کی تصحیح کے سلسلے میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ "الہی" مصرع اول کا قافیہ ہے لہٰذا مصرع ثانی کا قافیہ بھی "ہی" پر ختم ہونے والا کوئی لفظ ہونا چاہیے۔ "مہ" واضح اشارہ کر رہا ہے کہ وہ لفظ "ماہی" ہی ہو سکتا ہے۔ منور گشتہ از مہ تا بماہی۔ قیاس کہتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے "تا" (بمعنی تک) کو بماہی کے ساتھ "غتربود" کر کے "تاب" (یعنی چمک) کی جمع بنالی۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں میں نقل شدہ ابیات و اشعار میں "غتربود" کی متعدد مثالیں مل جائیں گی۔

(۱۲) خجستہ پیکے از مہدی قلی خان رسیدہ این مژدہ داد از لطف و احسان (ص ۱۹/س ۱)

دوسرا مصرع ناموزوں ہے۔ ایک حرف کی مسخ شدگی اور ایک غیر ضروری لفظ "این" کے اضافے نے اسے بحر و وزن سے گرا دیا۔ "رسیدہ" کا ہائے ہوز در اصل واو عطف (رسید و) ہے اور اس کے بعد کا "این" زاید اور قطعی غیر ضروری ہے۔ جب مژدے کی نوعیت یعنی "لطف و احسان" کی صراحت موجود ہے تو وہاں "این" کی ضرورت ہی کیا؟ شاعر نے یہ مصرع اس طرح کہا ہے:

رسید و مژدہ داد از لطف و احسان

(۱۳) ع نہادش[1] زندہ رودش جبّہ بر در

"جبہ" کے اوپر تخلص کی علامت (ــــ) لگانے کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا۔ غالباً تشدید بگڑ کر یہ صورت اختیار کر گئی۔ لفظ جبہہ (بمعنی پیشانی) میں "ب" مشدد نہیں مضموم[2] ہے۔

---

[1] معارف ڈاکٹر صاحب نے "نہادہ زندہ رود ش جبہ بر در" لکھا تھا۔ مگر مقالہ نگار نے اسے نہادش کر دیا۔
[2] مضموم بھی غلط ہے، صحیح ساکن ہے۔ (معارف)

(۱۴) کہ شاہ امروز در باغست چون گل رسد بر گوشہ چرخ افغان بلبل (ص ۱۹/س ۱۰، ع ۱)

دوسرا مصرع موزوں نہیں۔ لفظ "گوش" اس طرح مروڑا گیا کہ اس نے مصرعے میں ایک غیر متعلق لفظ "گوشہ" کی شکل اختیار کر لی۔ ساتھ ہی مصرعے کا وزن بھی اس گوشمالی کی زد میں آگیا۔ اصل مصرع یہ ہے: رسد بر گوش چرخ افغان بلبل

(۱۵) شرف شو بپابوس شہ امروز کہ ہست این عید قربان تو نوروز (ص ۱۹/س ۹، ع ۱)

"شرف" کے بجائے "مشرف" پڑھیں۔ موجودہ صورت میں مصرع وزن سے خارج ہے۔

(۱۶) برنگ غنچہ من زین مژدہ خندید چو گل از خرمی بر خویش بالید (ص ۱۹/س ۱۱، ع ۱)

"من .... خندید" (!!!) خندید چونکہ بالید کا قافیہ ہے اس لیے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ "من" غیر متعلق اور تحریف شدہ لفظ ہے۔ اس کے بجائے "دل" قرین صحت معلوم ہوتا ہے۔

(۱۷) کہ ہرگز غیر یارش در نظر نیست ز گلزار و ز گلچینش خبر نیست (ص ۲۱/س ۱۰)

"گلچین" یا "ز گلچین" کس زبان کا لفظ ہے اور اس کے کیا معنی ہیں؟[1] اس کا علم ڈاکٹر صاحب کو ہوگا۔ راقم صرف اتنا جانتا ہے کہ اس مسخ شدہ لفظ کی مکتوبی شکل اعلان کر رہی ہے کہ اس کی درست قرات "گلچین" ہے اور ضمیر واحد غایب کے اتصال کے ساتھ "گلچینش"۔ اس تصحیح کے بعد اب مصرعے میں گلزار کے بعد واو عطف کی کمی رہ جاتی ہے۔ درست مصرع بطور ذیل ہے۔ ز گلزار و ز گلچینش خبر نیست

(۱۸) دمی کردن بیاد زندگانی بود خوشتر ز عمر جاودانی (ص ۲۱/س ۱۷)

---

[1] معارف پہلے لکھا جا چکا ہے کہ یہ ڈاکٹر صاحب کی غلطی نہیں ہے۔

ایک حرف کی کمی مصرع اول کے وزن میں خلل انداز ہے۔ "یار" کو یائے وحدت کے ساتھ "یاری" لکھا جائے: دمی کردن بیاری زندگانی

(۱۹) شرابی ده که چون رخ پریه وزد تجلی وادی ایمن بسوزد (ص ۲۲/س ۷)

مصرع اول میں "پریه وزد" نہ صرف مہمل اور لغو ہے بلکہ مصرعے کو ناموزوں بھی بنا رہا ہے۔ اگر دوسرے مصرعے کے مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے تھوڑے غور و تامل سے کام لیا جائے تو اس مسخ شدہ لفظ کی اصل صورت یعنی "بر فروزد" کی بازیافت دشوار نہیں۔ اب پہلا مصرع یوں پڑھا جائے گا: شرابی ده که چون رخ بر فروزد

(۲۰) نهادم نام او را رمز الریاحین که در وی هست گوهری ناسفته (ص ۲۶/س ۳)

"را" کے غیر ضروری اضافے سے پہلا مصرع وزن سے باہر ہو گیا ہے۔ دوسرا مصرع ناموزوں بھی ہے اور قافیے سے محروم بھی۔ قیاس ہے کہ یہ مقدم یا موخر بیت کا مسخ شدہ مصرع ثانی ہے۔ اسے نقل کرنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب کم از کم اتنا تو غور فرما لیتے کہ "ریاحین" کا قافیہ "ناسفتہ" نہیں ہو سکتا۔ علاوہ بریں "ناسفتہ" اس بحر اور وزن میں قافیے کی حیثیت سے آ بھی نہیں سکتا۔ "ناسفتہ" مفعولن کے وزن پر ہے اور "سفتہ" فعلن کے وزن پر۔ جبکہ اس شعر میں بحر کے عروض و ضرب دونوں ہی رکن مقصور (یعنی مفاعیل) ہونگے کیونکہ مصرع اول میں اسی وزن کا لفظ "ریاحین" بطور قافیہ موجود ہے۔

(۲۱) ای مونس و غمگسار دیرینۂ من بسی یاد تو دل مباد در سینۂ من (ص ۲۶/س ۱۶)

یہ رباعی کی بیت اول ہے۔ اس کے مصرع ثانی کا پہلا لفظ "بسی" دراصل حرف نفی "بی" کی مسخ شدہ صورت ہے۔ چونکہ رباعی تذکرہ نصرآبادی کے مطبوعہ نسخے سے نقل کی گئی ہے اس لیے گمان ہے کہ اس میں "بی" کی شکل "بسی" رہی ہوگی اور اسے ڈاکٹر صاحب نے "بسی" پڑھ لیا۔ تعجب تو اس بات پر ہے کہ انہیں مصرعے کے بے معنی ہونے کا احساس بھی نہیں ہوا۔

(۲۲) زبر دستی را کجا باک از زیر دستی بود هر که باشد در بلندی بیمش از پستی بود (ص ۲۷/س ۹)

پہلا مصرع تحریف کا شکار ہو کر وزن سے ساقط ہو گیا۔ اسے مسخ اور وزن و معنی سے محروم کرنے کی ذمہ داری ڈاکٹر صاحب پر عاید ہوتی ہے۔ مصرعے کی غلط قرأت کے وقت ان کے پیش نظر یہ مسلمہ آفاقی حقیقت رہی ہوگی کہ طاقت ور کم زور سے نہیں ڈرتا۔ مگر شاعر کا مدعا اس کے برعکس ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ "زیر دست" کو "زبر دست" سے کیا "باک"؟ اس کا اثبات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جو بلندی پر ہو اسے پستی کا خوف لاحق ہوتا ہے۔ صحیح شعر اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے:

زیر دستی را کجا باک از زبر دستی بود هر که باشد در بلندی بیمش از پستی بود (ص ۲۷/س

(۲۳) گوشۂ ابرو چو پیش از وعده بنمای رواست گر هلال عید سی کم یک نماید خوشنماست

"بنمای" پہلے مصرعے کے وزن میں خلل پیدا کر رہا ہے۔ اس کے بجائے "بنمائی" چاہیے۔ "بنمای" امر ہے اور مصرعے کا لہجہ اس کی جگہ مضارع "بنمائی" کا مقتضی ہے۔ منشائے مصنف یہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے لیے ایک بات اور واضح کرتا چلوں کہ "بنمائی" سکون نون کے ساتھ بر وزن "کج رائی" نظم ہوا ہے اور قطعی طور پر درست ہے۔

(۲۴) مصمم بود شه را عزم جای (ص ۲۷/س ۱۰)

"جای" کو یائے تعمیم کے ساتھ "جائی" لکھتے تو مصرع بھی نقص سے محفوظ رہتا اور زبان بھی قواعد کے لحاظ سے درست ہو جاتی۔ موجودہ صورت میں اس کا رکن آخر

"مفاع" رہ جاتا ہے جبکہ اسے "مفاعی" ہونا چاہیے جسے "فعولن" سے بدل دیا جاتا ہے۔

(۲۵) حبذا اسدی کہ از خارا بدپیش زندہ رود — از عطای شاہ دین عباس ثانی بستہ اند (ص ۲۷، س ۱۵)

"بہ" کو "بد" لکھ کر پہلے مصرعے کو بے وزن اور مہمل بنا دیا۔ اس کی صحیح قرأت یوں ہے: حبذا اسدی کہ از خارا بہ پیش زندہ رود

(۲۶) بہر ماریخش گذشت از آب رمزی نوشت — سد سکندر ز آب زندگانی بستہ اند (ص ۲۷، س ۱۶)

بصورت موجودہ دونوں مصرعے وزن سے خارج ہیں۔ پہلے مصرعے کو وزن اور زبان کے اعتبار سے درست کرنے کے لیے رمزی کے بعد واو عطف درکار ہے۔ دوسرا مصرع "سکندر" کو "اسکندر" لکھنے سے موزوں اور منشائے مصنف کے عین مطابق ہو جاتا ہے۔

مصرع ثانی مادۂ تاریخ ہے جس سے "آب" کے عدد (۳) کے تخرجے کے بعد سال ۱۰۶۵ھ برآمد ہوتا ہے۔

رمزالریاحین کے متن اور دیگر مآخذ سے ڈاکٹر صاحب کے نقل کردہ اشعار وابیات میں جن غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے کم و بیش ان تمام کے ذمہ دار وہ خود ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اشعار وابیات کی صحت کے مشکوک ہونے کا اظہار بھی کسی علامت کے ذریعے نہیں فرمایا۔ لہٰذا راقم یہ رائے قائم کرنے میں حق بجانب ہے کہ ان کی نظر میں یہ تمام اشعار وابیات اسقام سے پاک اور درست ہیں۔ اس رائے کے درست ہونے کی صورت میں پھر یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب فارسی زبان اور شعریات سے کما حقہ آشنا نہیں چنانچہ اشعار کی قرأت کے دوران قدم قدم پر ان سے لغزشیں ہوتی ہیں۔ طبع موزوں سے محرومی ان کی

سب سے بڑی مجبوری ہے مگر شاید انہیں اس کا احساس نہیں۔

کچھ زبان و بیان کے بارے میں ڈاکٹر صاحب اپنے ایک وضاحتی مضمون "تصحیح و توضیح" میں فرماتے ہیں:

"تحقیق میں سہو و تسامح کی بڑی گنجایش ہوتی ہے"۔[1]

لفظ "گنجایش" کے بے محل استعمال سے قطع نظر، راقم الحروف کا خیال ہے کہ اس قول کا اطلاق صرف واقعات و حقائق کی چھان بین پر ہی نہیں، ان کی مخطوطہ خوانی اور اردو نثر نویسی پر بھی ہوتا ہے۔ فارسی مخطوطوں کی قرأت میں ان کے لیے سہو و تسامح کی گنجایش کا اندازہ رمزالریاحین میں منقولہ اشعار وابیات پر مذکورہ بالا تبصرے سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ رہی ان کی اردو نثر نویسی، سو اس کا حال بھی ملاحظہ ہو۔

الفاظ کا بے مورد استعمال انشاپردازی کی کوشش میں ڈاکٹر صاحب کی زبان نہ صرف عجیب و غریب اور بعض مقامات پر مضحکہ خیز بن جاتی ہے بلکہ "معمے" اور "چیستان" کی حدوں کو چھو لیتی ہے۔ انکی اردو نثر میں الفاظ کے بے محل استعمال کی بھی "بڑی گنجایش" ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) دیگر شعرا نے بھی اپنی اپنی بساط اور لیاقت کے پیش نظر طبع آزمائی کی۔ (ص ۶)

(۲) حاجی میرزا حبیب اللہ (عرف عبداللہ) کدخدائی کا پیشہ کرتے تھے۔[2] (ص ۸)

---

[1] معارف، مارچ ۱۹۹۲ء: ص ۲۱۷

[2] کدخدا کے لغوی معنی صاحب خانہ کے ہیں۔ مجازاً شادی شدہ مرد یا عورت کو بھی کہتے ہیں۔ اصطلاح اداری میں ناظر بیوتات کے معاون "رئیس صنف" کو بھی کہتے ہیں۔ (سازمان اداری حکومت صفوی، مینورسکی (ترجمہ از مسعود رجب نیا) مقدمہ محمد دبیر سیاقی، تہران ۱۳۳۴ خورشیدی: ص ۴۸ و ۴۹ ج ۱) راقم الحروف کی معلومات کے مطابق کدخدائی کوئی پیشہ نہیں۔

(۳) عارف نوشاہی (حالیہ ایران) نے رمزی کاشانی کا سنہ پیدائش ..... (ص ۱۱)

(۴) اصفہان دراصل رمزی کے فنون لطیفہ کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ (ص ۱۴[1])

(۵) قم کو روحانیت، شیراز کو سعدی و حافظ کی بدولت فوقیت حاصل ہے۔ (ص ۱۴)

(۶) بادشاہ نے اپنے مخصوص باغ کی توصیف و ستایش کی درخواست کی تاکہ رمزی کا مشاہدہ اور دعوت نظارہ ادبی شہ پارہ اور ادبی تاریخ کا جز بن جائے۔ (ص ۱۵)

(۷) اصفہان کی صبح و شام، نہر و حوض، مچلتے ہوئے فوارے، بلند و بالا عمارتیں، روشیں اور ہر قسم کے درختوں اور پھولوں کا رمزی نے نہایت چابک دستی سے محاکمہ کیا، حتیٰ کہ خود بادشاہ نے اسے باغ بہشت نما قرار دیا۔ (۹) (ص ۱۶-۱۵)

(۸) الغرض رمزی کا یہ تمثیلی مناظرہ اور باغ جنان کا منظوم محاسبہ فارسی شعر و ادب کا شاہکار بن گیا۔ (ص ۱۶)

(۹) فتاحی نے "قصۂ حسن و دل" کے ساتھ اس کا آغاز کیا تھا لہٰذا یہ سلسلہ جاری رہا (ص ۱۶)

(۱۰) ان کی خوبی و زشت کو رمزی نے شعری جامہ پہنا کر پیش کیا۔ (ص ۱۷)

(۱۱) لہٰذا رمزی ہماری داد و ستد کے حد درجہ مستحق قرار دیے جا سکتے ہیں (ص ۱۷)

(۱۲) اس کے بعد رمزی نے ساقی نامہ منظوم کیا ہے۔ (ص ۲۱)

تناقض | رمزالریاحین کی صنفی حیثیت بیان کرنے میں تناقض کی جو صورتیں پیدا ہوئی ہیں ان کا مفصل ذکر کیا جا چکا ہے۔ ان سطور میں تناقض کے چند مزید موارد کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

[1] معارف: ص ۱۲ صحیح ہے۔

"رمزی کا یہ کارنامہ فارسی شاعری میں اختراع کی حیثیت رکھتا ہے۔" (ص ۱۵)

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"تمثیل نگاری فارسی ادب کی قدیم روایت رہی ہے۔ فتاحی نیشاپوری نے "قصۂ حسن و دل" کے ساتھ اس کا آغاز کیا تھا، لہٰذا یہ سلسلہ جاری رہا اور رمزی نے بھی اسی تمثیلی انداز کو اپنایا۔" (ص ۱۶)

بیان اول میں اگر "اختراع" سے ڈاکٹر صاحب کی مراد پھولوں کا موضوع ہے، تب بھی اسے اختراع کے بجائے "ندرت موضوع" کہنا چاہیے۔

اسی طرح شاہ عباس ثانی کے دور حکومت میں ایران کے سیاسی اور معاشرتی حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس زمانے میں آسودگی، فارغ البالی اور بے فکری کا دور دورہ رہا۔" (ص ۶)

پھر بلا فصل ای۔ جی۔ براؤن کا یہ بیان نقل فرماتے ہیں:

"The more he was beloved by his subjects and The more feared by his neighbours."

منقولہ بالا دونوں بیانات میں تسلسل اور مطابقت کا فقدان ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ عبارت کی ترقیم کے بعد براؤن کے بیان کا غیر ضروری طور پر اضافہ کیا گیا ہے۔ براؤن کا بیان نقل کرنے کے فوراً بعد تحریر فرماتے ہیں:

"لہٰذا ادیبوں اور شاعروں نے شعر و ادب کی طرف توجہ مبذول کی جس کے نتیجے میں صفوی عہد کی کتابیں زندہ جاوید ہو گئیں۔" (ص ۶)

یہ جملہ بھی براؤن کے قول "وہ (بادشاہ) رعایا میں جتنا ہر دلعزیز تھا اتنا ہی

پڑوسی (حکمرانوں) سے خوفزدہ تھا" سے نامربوط ہوگیا۔ عبارت میں ربط و تسلسل قایم رکھنے کی انسب صورت یہی تھی کہ براؤن کے قول کو جزو[1] عبارت بنانے کی غیرضروری کوشش نہ کی جاتی۔ اب موخر جملے سے مستفاد ہونے والا مفہوم ملاحظہ فرمائیں:

"بدامنی کے زمانہ میں شاعر و ادیب تو موجود تھے، مگر ان کی توجہ شعر و ادب کی طرف مبذول نہیں تھی۔ امن قایم اور حالات پُرسکون ہوتے ہی انھوں نے شعر و ادب کی طرف توجہ مبذول کی جس کے نتیجے میں صفوی عہد کی کتابیں زندہ جاوید ہوگئیں۔ (اگر وہ ایسا نہ کرتے تو صفوی عہد کی کتابیں زندہ جاوید نہ بنتیں!!) ۔ (گوشۂ گمنامی میں پڑی رہ جاتیں)!!!

---

[1] معارف: محققین کے نزدیک صحیح املا جزء ہے، لیکن اضافت میں واو اور بغیر واو دونوں صحیح ہے (مقالات صدیقی ص۲۵۹ مطبوعہ اتر پردیش اردو اکاڈمی ۱۹۸۳ء۔

دار المصنفین کی نئی کتابیں

مشاہیر کے خطوط:۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ان کے دور کے مشاہیر فضلاء نے جو خطوط لکھے تھے یہ کتاب ان کا مجموعہ ہے جن سے اس دور میں پیش آنے والے اہم واقعات، سیاسی رجحانات اور مختلف دینی، علمی، ادبی اور ملی و قومی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے، یہ کتاب مولانا الطاف حسین حالی، میر سید اکبر حسین الہ آبادی، سید مہدی حسن افادی، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی، مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر محمد اقبال، مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے مشاہیر علم و ادب کے خطوط پر مشتمل ہے۔ صفحات ۱۹۰ مع خوبصورت ڈسک کور۔ قیمت ۳۵ روپیے۔

الاسلام والمستشرقون:۔ ۱۹۸۲ء میں دار المصنفین میں "اسلام اور مستشرقین" کے موضوع پر جو بین الاقوامی سیمینار ہوا تھا یہ اس میں پڑھے گئے عربی مضامین کا مجموعہ ہے۔
صفحات ۱۸۰ قیمت ۳۰ روپیے

سوئے حرم

از ضیاء الدین اصلاحی

(۵)

۱۱ ذی الحجہ کو مغرب بعد جب نثار رفیع صاحب مجھ سے انٹرویو لے رہے تھے تو ضیاء الدین رحمانی صاحب میرے کمرے میں آئے، میں نے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا، کچھ دیر بیٹھ کر وہ چلے گئے اور دوسرے روز صبح ناشتہ کے بعد پھر آئے اور کہنے لگے رات ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف سے آپ کی ملاقات کی تقریب پیدا ہوگئی تھی اسی لیے میں آیا تھا مگر آپ کا انٹرویو چل رہا تھا، اس وقت موقع ہو تو میرے ساتھ آئیے، چنانچہ وہ مجھے اپنے ایک دوست جناب محمود یعقوب مراد صاحب کے پاس لے گئے، یہ ارجنٹائنا سے تشریف لائے تھے اصلاً گجراتی ہیں لیکن بسلسلۂ تجارت ۲۶ برس سے ارجنٹائنا میں مقیم ہیں، تبلیغ و دعوت کے کام سے خاص دلچسپی ہے، ان کی کوششوں سے وہاں کچھ لوگ اسلام بھی لا چکے ہیں، اسی بنا پر ڈاکٹر صاحب انہیں بہت عزیز رکھتے ہیں اور بیرونی ملکوں کے دورے میں عموماً انہیں اپنے ساتھ بھی لے جاتے ہیں۔ ضیاء الدین رحمانی صاحب نے جب ان سے میرا تعارف کرایا تو انھوں نے کہا کل کہاں غائب ہوگئے تھے؟ آپ کا اور دار المصنفین کا تذکرہ ڈاکٹر صاحب سے آیا تو انھوں نے خود ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اچھا چلیے آج پھر کوشش کی جاتی ہے، وہ میرے لیے فوراً بسکٹ اور پھل لائے اور اصرار سے کھلایا۔

محمد یعقوب مراد صاحب مجھے ڈاکٹر صاحب کے آفس لائے اور باہر ہی بیٹھا کر اندر چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد مجھے بھی بلا لیا، میں ڈاکٹر صاحب کو سلام کر کے ان کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا اور عرض کیا "میں آپ سے ملنے کا بڑا مشتاق اور متمنی تھا اور آپ کا بیحد شکر گذار ہوں کہ آپ کی دعوت پر حج بیت اللہ سے مشرف ہو رہا ہوں، میں دار المصنفین اعظم گڈھ سے حاضر ہوا ہوں، اس کو ۷۵ برس پہلے علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ نے قائم کیا تھا، اس وقت اس کی مجلس انتظامیہ کے صدر مرحوم ریاست حیدرآباد کے موجودہ پرنس نواب مکرم جاہ بہادر اور مجلس عاملہ کے سربراہ دنیائے اسلام کے نامور عالم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ ہیں جو مولانا سید سلیمان ندویؒ کے شاگرد رشید ہیں، دار المصنفین نے اسلام، اسلامی علوم اور اسلامی تاریخ کی نہایت اہم خدمات انجام دی ہیں اور مستشرقین اور مخالفین اسلام کے اعتراضات کا جواب بھی علمی اور سائنٹفک انداز میں دیا ہے، اس نے ان موضوعات پر تقریباً ۲۰۰ کتابیں شایع کی ہیں جن میں سب سے اہم سیرۃ النبیؐ کی سات جلدیں ہیں، اردو کیا عربی میں بھی سیرت پر ایسی بلند پایہ کتاب نہیں لکھی گئی ہے، مولانا عبدالرؤف ملک نے بتایا تھا کہ رابطہ عالم اسلامی نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ کا ترجمہ قرآن تقسیم کے لیے شایع کیا ہے، تحریری درخواست دینے پر تقسیم کے لیے وہ مل جائیگا، چنانچہ میں نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں درخواست پیش کی تو انھوں نے اس پر حکم صادر فرما دیا، لیکن ابھی قرآن پاک کے نسخے نہیں ملے[1]۔ اس کے لیے اور ان کے دار المصنفین تشریف لانے کے سلسلہ میں میں نے ڈاکٹر صاحب کو ایک خط لکھا مگر جواب نہیں آیا، سید ضیاء الدین رحمانی نے لکھا ہے کہ وہ امریکہ گئے ہوئے ہیں[2]۔

[1] رابطہ کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ بمبئی میں وہ نسخے آ گئے ہیں [2] اب ڈاکٹر صاحب کا جواب آ گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب بڑے باوقار، سنجیدہ اور متین شخص ہیں، میں جب ان سے باتیں کر رہا تھا تو وہ بہت توجہ سے سُن رہے تھے، درمیان میں دو ایک بار سے زیادہ نہیں گویا ہوئے، جب میں نے انہیں دار المصنفین تشریف لانے کی دعوت دی اور اسکے لیے اصرار کیا اور کہا فروری میں تشریف لانا مناسب ہوگا تو انھوں نے کہا ہاں فروری کا مہینہ ٹھیک رہے گا، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ آپ نے میری حقیر دعوت مسترد نہیں فرمائی، میں نے آپ کا قیمتی وقت لیا اور دیر تک سمع خراشی کی جس کے لیے نادم ہوں اس پر ڈاکٹر صاحب محجوب ہوئے اور میں باہر چلا آیا۔

ڈاکٹر صاحب سے میری گفتگو ہو رہی تھی تو محمود یعقوب مراد صاحب بھی موجود تھے، باہر نکلنے پر انھوں نے کہا کہ آپ نے مجھے بہت شرمندہ کیا۔ میں نے تو ڈاکٹر صاحب سے کہا تھا کہ آپ عربی میں گفتگو نہیں کر سکتے لیکن آپ نے ابتدا عربی سے کی اور آخر میں اردو میں بولنے لگے۔ میں نے ان کے ساتھ آپ کی تصویر لی ہے تاکہ دوسروں کو بھی معلوم ہو جائے کہ آپ کی ملاقات واقعتاً ان سے ہوئی تھی، انھوں نے کہا میں ضیاء الدین رحمانی کو تصویر دے دوں گا، وہ آپ کو بھیج دیں گے، مگر ابھی تک یہ مجھے نہیں ملی[1]۔ میں نے محمود یعقوب صاحب سے کہا ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف جب دار المصنفین تشریف لائیں گے اس وقت آپ بھی ضرور تشریف لائیں، انھوں نے کہا جی تو میرا بھی چاہتا ہے مگر دیکھئے، پھر یہاں قیام کے زمانہ میں ان سے دو تین بار ملاقات ہوئی۔

انہی ایام میں دو تین فلسطینی نوجوانوں سے بھی ملاقات ہوئی، ان کے نام یاد نہیں رہے، ان میں سے ایک بڑے صالح، دیندار اور ذی علم تھے، دینی حمیت اور لوگوں کی خدمت گذاری کا جذبہ بھی ان میں بدرجہ اتم تھا، عربی میں بڑی عمدہ تقریر کرتے تھے، جس کو سننے کا چند بار

[1] اب تصویر مل گئی ہے۔

موقع ملا۔

بالائے سرش زہوشمندی   می تافت ستارۂ بلندی

غالباً ۱۵ یا ۱۶ ذی الحجہ (۱۴ یا ۱۵ جون) کو ہم لوگ صبح ۹ - ۱۰ بجے منیٰ سے مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے جہاں نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کبھی قریش کی نگاہوں سے چھپ چھپا کر رات کے سناٹے میں تشریف لے گئے تھے کیونکہ مکہ کی زمین آپ کیلئے تنگ ہوگئی تھی اور مدینہ اس رحمت تمام کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے بے تاب تھا، عورتیں اور چھوٹی چھوٹی بچیاں آپ کی تشریف آوری پر یوں زمزمہ سنج تھیں

طلع البدر علینا   من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا   ما دعا للہ داع

اللہ نے اپنے فضل سے آج ہمیں بھی موقع دیا کہ نبیؐ کے شہر کو دیکھیں اور اپنے ایمان و یقین میں اضافہ کریں۔

راستے میں کہیں آبادی نہیں ملی، البتہ سڑکوں کے کنارے کہیں کہیں منزلیں ملیں جہاں مدینہ جانے والے حجاج استراحت کے لیے رکتے اور ناشتہ کرتے اور چائے پیتے ہیں، ہم لوگوں نے بھی ایک منزل پر پڑاؤ کیا جہاں پاکستانی ہوٹل تھا، وہیں کھانے کے پیکٹ ملے ہوٹل میں چائے پی اور ظہر کی نماز پڑھ کر پھر روانہ ہوئے۔ تقریباً ۵ بجے شام کو درود و استغفار پڑھتے ہوئے مدینہ منورہ میں داخل ہوئے، لوگوں نے بتایا کہ ہمیں جن راستوں سے لایا گیا تھا انہی راستوں سے سرکار دوعالمؐ بھی ہجرت کے وقت تشریف لائے تھے۔

ہم لوگوں کے قیام کا نظم مرکز الحرمین السکنی میں کیا گیا تھا وہاں سامان رکھکر فوراً

وضو کیا اور جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ، سیین امین اور خورشید کامل قدوائی کے ساتھ مسجد نبویؐ گیا، روضۃ الجنۃ میں دو رکعت نماز ادا کرکے دربار رسالت میں سلام پیش کرنے کے لیے حاضر ہوئے اس وقت میری زبان پر ڈاکٹر محمد اقبال کا یہ شعر آگیا ؎

کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم   وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغ سکندری

پھر سب لوگ عصر کی نماز پڑھ کر دعا و تلاوت میں مشغول ہوگئے، سیٹھ صاحب وغیرہ مغرب سے قبل ہی اٹھ کھڑے ہوئے، میں نے کہا میں عشا تک یہیں رہوں گا، آپ لوگ جب چلنے لگیں تو مجھے لے لیں، عشا کی نماز سے فارغ ہوا تو سیٹھ صاحب نے آواز دی ان کے ساتھ جنت البقیع کے مکینوں کو سلام کرتے ہوئے ہوٹل آئے، مسعود صاحب نے پوچھا تم کو یہاں کسی سے ملنا ہے یا نہیں؟ انھوں نے کہا میں نے ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی استاذ مدینہ یونیورسٹی کو فون کیا ہے، وہ آرہے ہیں، تھوڑی دیر میں وہ واقعتاً آگئے اور اصرار کرنے لگے کہ ان کے گھر چل کر رات وہیں گزاروں، میں نے معذرت کی اور کہا کہ ممکن ہے صبح رابطہ کے میزبان ہمیں مدینہ منورہ کے آثار و مشاہد دکھانے لے جائیں، یہ سن کر وہ خاموش ہوگئے، سب لوگوں کو اس وقت کھانے کا انتظار تھا، کچھ لوگ تو انتظار ہی میں سوگئے اور بعض لوگ باہر جاکر کچھ کھا پی آئے، میں بھی لیٹ چکا تھا مگر میرا حال یہ تھا کہ ؎

کبھی کشمکش میں گزر گئیں مری زندگی کی راتیں   کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

اس لیے نیند نہیں آرہی تھی، بڑی رات گئے میزبان پیکٹ لے کر آئے اور آواز دینے لگے، میں اٹھ کر گیا تو ان لوگوں نے ایک پیکٹ مجھے دیا اور کہا اپنے کمرے والوں کو بھی بتا دیجئے، یہیں باہر ان کا کھانا رکھا ہوا ہے، میں نے سب کو جگانے کی

کوشش کی مگر ندوا ایک کے سوا کوئی نہیں اٹھا، رات دیر میں سونے کی وجہ سے صبح سویرے آنکھ نہیں کھلی، اس لیے مسجد نبویؐ میں تہجد اور فجر کی جماعت میں شرکت نہیں ہو سکی، اس محرومی پر بڑا قلق اور سخت انقباض ہوا۔

دوسرے روز نہا دھو کر اور ناشتہ کر کے ہم لوگ ۹ بجے مدینہ منورہ کے مقدس مقامات دیکھنے گئے، جنت البقیع، شہدائے احد اور سیدنا حمزہؓ کے مزاروں پر گئے، غزوۂ خندق جہاں ہوا تھا وہاں متعدد چھوٹی چھوٹی مسجدیں نیچے بھی اور پہاڑیوں پر بھی تعمیر ہو گئی ہیں جو کبار صحابہ کے ناموں سے موسوم ہیں جیسے مسجد ابوبکرؓ، مسجد عمر فاروقؓ، مسجد عثمانؓ، مسجد بلالؓ اور مسجد سلمان فارسیؓ وغیرہ، بعض بعض میں دو رکعت نماز بھی ادا کی، مسجد قبلتین اور مسجد فتح کی زیارت بھی کی گئی اور وہاں بھی دو رکعت نماز پڑھی گئی، آخر میں مسجد قبا آئے اور ظہر کی فرض نماز اسی میں ادا کی گئی۔

مرکز الحرمین السکنی واپس آیا تو ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی میرے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے کہ آپ لوگوں کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی میں یہاں آگیا تھا اور اسی وقت سے انتظار کر رہا ہوں، اب مزید دیر نہ کیجئے فوراً کھانے کیلئے چلیے، میں نے کہا رات تو اس کا کوئی ذکر نہ تھا، خواہ مخواہ آپ نے زحمت کی، انھوں نے کہا یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ لوگ یہاں آکر چلے جائیں اور میں اپنا گھر بھی نہ دکھاؤں، میں بہت تھک گیا تھا لیکن ڈاکٹر محمد اجمل سے خاص تعلق کی وجہ سے میرے لیے ان کی دعوت کو مسترد کر دینا آسان نہیں تھا، وہ میرے شفیق استاذ مولانا اختر احسن اصلاحی برد اللہ مضجعہ وجعل الجنۃ مثواہ کے نواسے اور خود بھی بہت لائق اور ہونہار ہیں۔ ان کے گھر کا راستہ ۱۵ منٹ سے زیادہ کا نہ تھا مگر پروفیسر

مسعود وہیں سے اپنے عزیزوں کے پاس جانے والے تھے، ان کے ساتھ انکا سامان بھی تھا اس لیے اجمل صاحب ٹیکسی سے اپنے گھر لوا گئے، وہاں ہندوستانی مذاق کا صاف ستھرا کھانا بہت رغبت سے کھایا، مسعود صاحب تو سو گئے مگر ہم دونوں لیٹے لیٹے باتیں کرتے رہے، غالباً سوا تین یا ساڑھے تین بجے انھوں نے کہا جلد وضو کر کے مسجد چلیں ورنہ جماعت نہیں ملے گی، چنانچہ ہم دونوں نے عصر کی نماز باجماعت مسجد نبویؐ میں ادا کی۔

نماز پڑھ کر باہر نکلے تو میں نے کہا کچھ کھجوریں خرید لی جائیں، انھوں نے کہا پہلے بس کو دیکھ لیں کہیں وہ نہ روانہ ہو جائے۔ دیکھا تو بسیں قطار سے کھڑی تھیں اور معلوم ہوا کہ ۵ بجے روانہ ہوں گی، ۴ سے زیادہ ہو چکا تھا اس لیے ہوٹل آکر عمرہ کا احرام باندھا اور سامان لے کر بس پر سوار ہو گیا، اجمل صاحب بھی ساتھ تھے، میں نے ان سے کہا مدینہ سے بالکل سیری نہیں ہوئی آپ کی یونیورسٹی دیکھنا چاہتا تھا، مکتبوں میں کتابیں دیکھنی تھیں تاکہ دارالمصنفین کے لیے ان کو منگانے کی صورت پر غور کرتا، مدینہ کی گلی کوچوں میں پیدل چلتا اور گھومتا پھرتا، خاصۂ خاصان رسلؐ سے بار بار کہتا کہ آپؐ کی امت پر عجب وقت پڑا ہے، نہ جانے کیا کیا ارمان اور حوصلے لے کر آیا تھا لیکن سب دل کے دل ہی میں رہ گئے۔

ع ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

اجمل صاحب یہ کہہ کر چل دیے کہ ممکن ہے اللہ تعالیٰ پھر یہ موقع نصیب کرے، کچھ دیر بعد جب ہماری بس روانہ ہوئی تو میں ڈاکٹر محمد اقبال کے وہ اشعار پڑھنے لگا جو انھوں نے "روح محمدؐ" کو مخاطب کر کے کہے تھے۔

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر — اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

وہ لذتِ آشوب نہیں بحرِ عرب میں — پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے

ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد — اس کوہ و بیاباں سے حدی خوان کدھر جائے

اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

۹-۱۰ بجے رات کو ہم لوگ غالباً اپنے مستقر منیٰ پہنچے، صبح حرم جانے کے لیے فکرمند تھا تاکہ عمرہ کر لوں، خیال تھا کہ رابطہ کی جانب سے گاڑی کا انتظام ہو جائیگا مگر جب تاخیر ہوئی تو ہمارے ایک نوجوان جو بھیونڈی میں رہتے ہیں ان کے اور ایک گجراتی نوجوان کے ہمراہ پیدل مکہ معظمہ گیا اور طواف وسعی اور ظہر کی نماز حرم میں ادا کر کے پیدل ہی منیٰ واپس آگیا۔

اب منیٰ میں گنے چنے دن ہی رہنا تھا، ۲۳ر جون کو صبح جدہ سے ہمارا جہاز دہلی کو جانے والا تھا، اس کے لیے ۲۲ ہی کو عشا کے وقت ہمیں منیٰ چھوڑ کر جدہ پہنچنا تھا۔ لیکن ابھی طواف وداع باقی رہ گیا تھا، اتفاق سے ۱۲ر جون کو رابطہ نے طواف وداع کو جانے والوں کے لیے گاڑیوں کا انتظام کر دیا چنانچہ ۲۰ ذی الحجہ مطابق ۲۱ر جون کو ہم لوگوں نے طواف وداع کیا اور کعبہ کے در و دیوار کو حسرت سے دیکھتے ہوئے مغرب بعد منیٰ واپس آگئے۔

رابطہ کے مہمان خانہ میں داخل ہوتے ہوئے ہمیں دو آدمی اس سے نکلتے ہوئے ملے، ان لوگوں نے جب حسین امین صاحب کو دیکھا تو بڑی گرمجوشی اور تپاک سے ملے۔ معلوم ہوا کہ ان میں ایک ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی کے برادر خورد ڈاکٹر محمد ہارون نگرامی

اور دوسرے ہمارے خاص کر مفر مامر حوم صباح الدین عمر صاحب کے داماد ہیں۔ یہ دونوں حسین امین صاحب کے عزیز ہوتے تھے، ان سے ملاقات کے لیے وہ اول روز ہی سے بڑے مشتاق تھے، لکھنؤ سے ان دونوں کے نام کے جو خطوط لائے تھے انہیں بھجوایا، ٹیلی فون کرنا چاہا اور ان کو پیغام بھی بھیجے مگر اب وہ مایوس ہو گئے تھے اور کہتے تھے کہ ان سے ملے بغیر ہی چلے جائیں گے لیکن جب یہ لوگ اچانک ان کو مل گئے تو انھوں نے اس کو ملاقاتِ مسیحا و خضر سے بہتر خیال کیا اور انکی خوشی کی کوئی حد و انتہا نہ رہی۔

دونوں صاحبوں نے بتایا کہ ایامِ حج میں یہاں آنا ممکن نہیں تھا، ہم نے بھی رابطہ قائم کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا، اس سے پہلے ایک روز آئے تو معلوم ہوا کہ سب مدینہ شریف گئے ہوئے ہیں، ہم لوگوں نے سمجھا کہ چند روز تو وہاں رکنا ہی ہوگا اس لیے آج آئے، اب ہمارے یہاں جدہ چلنے کے لیے تیار ہو جایئے، وہیں سے جہاز پر سوار کر دیا جائے گا۔ ہارون صاحب نے میری طرف ملتفت ہو کر فرمایا کہ کیا آپ ہم لوگوں کے ساتھ چلنا پسند کریں گے، میں نے کہا مجھے جدہ دیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔ انھوں نے کہا تب دیر نہ کیجیے ہیں آپ لوگوں کے پاسپورٹ یہاں سے لے لیتا ہوں اور آپ لوگ اپنے سامان رکھ کر تیار ہو جائیں، افسوس ہے کہ آپ لوگوں سے بہت دیر میں ملاقات ہوئی اب وقت ہی کیا ہے ورنہ جدہ اچھی طرح آپ لوگوں کو دکھایا جاتا۔

تھوڑی دیر میں ہارون صاحب ہمیں لے کر منیٰ سے روانہ ہوئے اور ۹-۱۰ بجے ہم لوگ ان کے گھر جدہ پہنچ گئے، وہاں ہم سب نے محسوس کیا جیسے اپنے ہی گھر آگئے ہیں، ہارون صاحب اور ان کی اہلیہ ہر خدمت کے لیے موجود رہتی تھیں۔

صبح ۲۲ر جون کو ہارون صاحب پہلے اپنے اسکول گئے وہاں سے آکر ناشتہ

سے فارغ ہوکر ہمیں لے کر اپنی گاڑی سے جدہ میں رابطہ کے دفتر کے لیے روانہ ہوئے،
جو تلاش کے باوجود انہیں نہیں ملا، وہاں انہیں ہمارے بارے میں اطلاع کرنی تھی۔
اس کے بعد سمندر کے ساحل لے گئے، وہاں شاہی محل دکھایا پھر بعض خاص عمارتیں
اور دکانیں دکھائیں۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ بھی صفائی ستھرائی اور متعدد حیثیتوں
سے ہندوستان کے شہروں سے بہت بڑھے ہوئے تھے اور جدہ کا تو پوچھنا ہی کیا۔

واپس آئے تو ہارون صاحب کی بیوی نے بہت عمدہ اور لذیذ کھانے کھلائے
جس کے بعد ہم لوگوں نے قیلولہ کیا، کھانے سے پہلے حسین امین صاحب کے ایک
پاکستانی ملاقاتی آگئے، وہ بھی کھانے میں شریک رہے، یہ دراصل لکھنؤ ہی کے رہنے
والے تھے۔ انھوں نے عربوں کا جو نقشہ کھینچا وہ بہت تکلیف دہ تھا لیکن اس میں
مبالغہ زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ یہیں ڈاکٹر محمد یونس نگرامی کے ایک صاحبزادے سے
بھی ملاقات ہوئی جن کی سعادتمندی کا تجربہ لکھنؤ ہی سے تھا، وہ روانگی سے پہلے
صبح کو جب آئے تو اپنے ساتھ عمدہ قسم کا سینٹ لائے اور ہدیتاً دیا، میں نے کہا
آپ تو چھوٹے ہیں اس کی کیا ضرورت تھی، انھوں نے کہا چچا جان جلدی میں کچھ سمجھ
میں نہیں آیا، اسے قبول کر لیجیے تو مجھے خوشی ہوگی۔

یہیں ڈاکٹر محمد یونس نگرامی صاحب کے ایک اور چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمد یوسف
نگرامی سے بھی ملاقات ہوئی جو ڈاکٹر محمد ہارون صاحب سے عمر میں بڑے ہیں، ان سے
دو تین نشستوں میں مختلف علمی، دینی، قومی، ملی مسائل اور دارالمصنفین کے بارے میں
گفتگو ہوئی، جس سے انکی واقفیت اور دردمندی کا پتہ چلا۔

انھوں نے دارالمصنفین کی ہر خدمت کے لیے اپنے کو پیش کیا اور کہا کہ اس کا

بڑا حق ہم پر ہوتا ہے، اس سے ہمارے والد ماجد مولانا محمد اویس نگرامی مرحوم وابستہ
رہ چکے ہیں علاوہ ازیں اس کی گوناگوں خدمات بھی ہیں۔ میری خواہش ہے کہ دارالمصنفین
کا یہاں اچھا تعارف کرایا جائے، یہاں کے لوگ اس سے ناواقف ہیں۔ اس کی
شکل یہ ہے کہ آپ اس کا ایک اچھا تعارف لکھ دیں، ہم لوگ اس کو عربی میں منتقل کرلیں گے
اور پھر وقت نکال کر آپ تنہا یا اپنے دو ایک رفیقوں کو لے کر یہاں آجائیں، غرض
سہ پہر کا پورا وقت ان سے گفتگو میں گزرا پھر وہ عصر کی نماز پڑھنے چلے گئے اور ہم
لوگوں نے بھی پڑھی۔ دونوں بھائی ایک ہی بلڈنگ میں ایک ہی منزل پر آمنے سامنے
رہتے ہیں۔ چلتے وقت صبح کو یوسف صاحب نے اپنی کچھ کتابیں بھی عنایت کیں۔

حسین امین صاحب کو ان کے پاکستانی دوست بہت اصرار کر کے اپنے گھر لے گئے
تھے اور وہ مغرب بعد واپس آئے، ان کے آنے کے بعد ہم لوگ صباح الدین عمر صاحب
کے خویش اور صاحبزادی سے ملنے ان کے گھر گئے، رات کا کھانا انہی کے یہاں تھا اور بڑا
پرتکلف تھا، میں نے ان لوگوں سے صباح الدین صاحب سے اپنا تعلق بتایا تو دونوں
میاں بیوی کا التفات میری جانب دوچند ہوگیا، جب ان کے یہاں سے آتے وقت
میں نے ان لوگوں کا شکریہ ادا کیا تو انھوں نے کہا یہ تو ہمارا فرض تھا، ہم نے تو کچھ بھی
نہیں کیا۔ کھانے اور نماز عشا سے فارغ ہو کر ہارون صاحب ہم کو جدہ ایرپورٹ لے گئے
اور وہاں کی ساری دشواریوں کو اپنی واقفیت اور تجربہ کی وجہ سے حل کرتے گئے اگر ہم
لوگ تنہا ہوتے تو نہ جانے کتنا پریشان ہوتے، سامان بک کرا کے وہ ہم لوگوں کو اپنے
گھر واپس لائے اور کہا آرام سے سوئیے، صبح پھر ایرپورٹ چھوڑ دیں گے، سب لوگ
تو واقعی سوئے مگر مجھے نیند نہیں آئی اور کروٹیں بدلتا رہا، سرزمین عرب چھوٹنے اور

یہاں سے تہی مایہ واپس جانے کا غم ستا رہا تھا۔

۲۳ جون کو صبح سویرے ناشتہ کرکے اور ہارون صاحب کی بیگم کا شکریہ ادا کرکے ہم لوگ ان کی گاڑی سے ایرپورٹ چلے آئے۔ کچھ دیر رک کر جو کارروائی باقی رہ گئی تھی وہ سب انجام دے کر ہارون صاحب ہم سے رخصت ہونے لگے اور کہا کہ اب آپ لوگوں کو صرف سوار ہونا رہ گیا ہے، مجھے بہت جلدی ہے، ورنہ یہ کام بھی کرکے جاتا۔ ہم لوگوں نے کہا بھئی آپ کے احسان سے تو ہم لوگ بہت زیربار ہیں، ورنہ معلوم نہیں کیا کیا پریشانیاں اٹھانی پڑتیں۔ وہ کہنے لگے ہمیں تو افسوس ہے کہ بہت آخر میں آپ لوگ ملے اور کچھ بھی خدمت کا موقع نہیں دیا، جدہ بھی اچھی طرح نہیں دکھا سکا۔

آٹھ بجے ہم لوگ جہاز میں سوار ہوچکے تھے، ۱۰ بجے کے قریب پرواز ہوئی، راستے میں کسی طرح کی زحمت نہیں ہوئی، مغرب کے وقت ہمارا جہاز دہلی پہنچا، ایرپورٹ کی کارروائی اور سامان حاصل کرنے میں بڑا وقت لگ گیا، ۹ بجے کے قریب ایرپورٹ سے باہر نکلا تو بڑی بھیڑ تھی لیکن بہت جلد مجھے میرے عزیز نیر اعظم سلمہٗ مل گئے اور وہ بڑے صبر و سکون سے اپنے گھر ابوالفضل انکلیو لے آئے۔ ان کے والدین اعظم گڈھ گئے ہوئے تھے لیکن انھوں نے اور ان کی بہن کہکشاں نے اپنے والدین کی کمی محسوس نہیں ہونے دی، پورے سفر میں میری طبیعت اچھی تھی لیکن دہلی پہنچ کر قدرے خراب ہوگئی ۲۴ جون کو آرام کیا اور یہاں کے اہل تعلق سے ملاقات نہیں کرسکا، شام کو صرف بھائی آفاق احمد صدیقی صاحب اور ان کی اہلیہ سے ملنے گیا اور ۲۵ جون کو اعظم سلمہٗ نے گومتی اکسپریس سے روانہ کردیا، رات میں ۱۲ بجے لکھنؤ آیا، ایک بجے بس مل گئی جس میں بڑی تکلیف ہوئی لیکن اسی سے اعظم گڈھ آگیا اور ۱۱ بجے دن کو شبلی منزل پہنچ گیا۔ جمعہ کا دن تھا۔ گلا پھنسا ہوا تھا اس لیے نماز پڑھانے سے معذرت کردی، چند روز بعد یہ تکلیف رفع ہوئی۔

یہی اس سفر کی سرگذشت تھی جسے قلم بند کرنے کا ارادہ نہیں تھا کیونکہ نہ اس میں کوئی اہم اور خاص بات تھی اور نہ میرے قلم میں وہ زور و اثر تھا جو ان مشاہدات کو مفید اور دلچسپ بنا دیتا، علاوہ ازیں اس طرح کی تحریروں میں خودستائی آہی جاتی ہے، اسی لیے میں نے نہ کوئی نوٹ تیار کیا تھا اور نہ یادداشت لکھی تھی، یہاں آنے کے بعد تقاضا و طلب سے مجبور ہونا پڑا، لیکن ایک ہی نمبر جولائی کے شمارہ کے بعد اسے بند کردینے کا ارادہ کیا تو علی گڈھ اور لکھنؤ کے بعض بزرگوں اور دوستوں نے پھر تقاضا کیا، خود سیدی و مطاعی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کا ایما بھی یہی معلوم ہوا، اس بنا پر ستمبر سے پھر معارف کے قیمتی صفحات اس کی نذر کرنے پڑے۔

حج سے واپس آیا تو میرے بڑے بھائی قمر اعظمی نے کانپور سے لکھا:

"حج کی واپسی کے بعد کا خط ملا تھا، اللہ نے قبول کرلیا ہو بس۔ عجیب اتفاق ہے کہ میں نے اعظم گڈھ کا طوفانی سفر کیا تھا تم نہیں تھے اس لیے بھاگ آیا، بعد کو معلوم ہوا کہ تم ان تاریخوں میں آگئے تھے، بہرحال اللہ قبول کرے بس۔

رحمتوں کا نزول ہوجائے میری محنت وصول.....

آنکھ میں قطرۂ ندامت ہے میرے مولیٰ قبول ہوجائے

یہ میں نے کعبہ میں بیٹھ کر ربِ کعبہ سے کہا تھا، یہ قطعہ اب تمھیں لکھ رہا ہوں اور دے رہا ہوں"

قارئین سے بھی اس پر آمین کہنے کی درخواست کرتا ہوں۔

لوگ سفرناموں میں مختلف شکایتوں کا ذکر کرکے مشورے اور تجویزیں پیش کرتے ہیں لیکن مجھے نہ کوئی خاص کمی دکھائی دی اور نہ کسی طرح کی تکلیف و شکایت ہوئی،

حجاج کو عموماً جو شکایتیں پیش آتی ہیں ان میں کچھ تو ناگزیر ادراتنے بڑے مجمع میں ضروری ہیں، اور کچھ ہر جگہ کی حج کمیٹیوں اور حکومتوں کی بے پروائی و بد انتظامی کا نتیجہ ہوتی ہیں اسکے لیے سعودی حکومت کو مورد الزام قرار دینا درست نہیں ہے۔ میرے گلے اور شکوے ان سے بالکل مختلف ہیں ؎

اوروں کا پیام اور میرا پیام اور ہے　　عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے

میں اس بات کا آرزومند ہوں کہ عربوں اور مسلمانوں کی حکومتیں ان خصوصیات کی حامل ہوں جو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں عطا کی تھیں، میرے نزدیک انہی میں ان کی عزت و سربلندی ہے اور آج وہ انہی کو ترک کر کے ذلیل و خوار ہوئی ہیں، مجھے ان سے شکایت ہے کہ وہ مغرب کا آلہ کار ہو کر اپنی قوت و طاقت اپنے ہی بھائیوں کے خلاف استعمال کر رہی ہیں، ان کی تن آسانی، سہولت پسندی اور آرام طلبی نے انہیں علم و ہنر سے محروم اور مفلوج کر دیا ہے ان کا سارا انحصار انہی مغربی قوموں پر ہو گیا ہے جو ان کی دوست نما دشمن ہیں، ان کو اپنی حقیقت اور عظمت سے آگاہ ہونا چاہیے اور وہ دوسروں کی ظاہری چمک دمک سے مرعوب ہونا چھوڑ دیں، اپنے بازوؤں میں زور و قوت پیدا کریں، کمزور سہاروں پر بھروسہ نہ کریں، شاید علامہ اقبال مرحوم کے کچھ اشعار سے میرے احساسات و جذبات کی ترجمانی ہو ؎

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا　　دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
آہ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے　　راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا　　ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
دیکھ آکر کوچۂ چاکِ گریباں میں کبھی　　قیس تو، لیلا بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو

وائے نادانی! کہ تو محتاج ساقی ہو گیا　　مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو　　خوف باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

بے خبر! تو جوہر آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل، یہ گھٹائیں　　یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں　　تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے　　دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے　　پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے

تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ!

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں　　آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں　　جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ!

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو　　ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے　　نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائیگا　　ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی　　اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاکِ رہگزر

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ　　"خواجگی" نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات

آ بتاؤں تجھکو رمزِ آیۂ اِنَّ الْمُلُوْكَ　　سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز — دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو

آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

علامہ اقبال نے صقلیہ کو مخاطب کر کے جو کچھ کہا تھا وہی میں سرزمین عرب کو مخاطب کر کے کہنا چاہتا ہوں:

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں — تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیاں

درد اپنا مجھ سے کہہ، میں بھی سراپا درد ہوں — جس کی تو منزل تھا، میں اس کارواں کی گرد ہوں

رنگ تصویر کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے — قصہ ایامِ سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا

خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رلواؤں گا

عرب اور مسلمانوں کی اصل کمی یہی ہے جس کو دور کرنے کیلئے دین سے وابستگی ضروری ہے اس لیے میری دعا یہ ہے کہ ؎

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل — اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے

بابیت، بہائیت اور پروفیسر براؤن

از جناب محمود احمد خاں دریابادی

ستمبر ۹۲ء کے معارف میں جناب ابوسعادت جلیلی صاحب کا محققانہ مضمون "ایران شناس براؤن" نظر سے گزرا اس میں ایک جگہ وہ تحریر فرماتے ہیں "پروفیسر براؤن نے عکہ میں بہاء اللہ مرزا حسین علی اور مرزا یحییٰ سے ملاقات کی" حالانکہ عکہ میں صرف مرزا حسین علی بہاء اللہ کا قیام تھا، مرزا یحییٰ جزیرہ قبرص کے شہر ماغوسا میں مقیم تھا، یہ دونوں سوتیلے بھائی ایک دوسرے کے حریف تھے۔

دراصل مرزا علی محمد باب شیرازی (پیدائش یکم محرم ۱۲۳۵ھ مقتول ۲۸ شعبان ۱۲۶۶ھ) نے ۱۲۶۰ھ میں بابیت کا دعویٰ کیا۔ اس سے اس کی منشا یہ تھی کہ وہ ایک بزرگ اور موعود ہستی (مہدی) کے فیوض کا دروازہ اور واسطہ ہے۔ پھر اس نے خود مہدیٔ موعود ہونے کا دعویٰ کیا اور اپنے سے دو ہزار سال بعد ایک اور ہستی جس کا نام اسی نے "من یظہرہ اللہ" رکھا تھا کی پیشنگوئی کی اور اس کے فضائل و مناقب مبالغہ آمیز انداز میں بیان کیے (بیان باب ۱۳ واحد ۳ از مرزا علی محمد باب)

مرزا یحییٰ نوری کو اس کے ماننے والے "صبح ازل" کے نام سے پکارتے ہیں وہ اور مرزا حسین علی بہاء اللہ مازندران کے موضع نور کے رہنے والے تھے، حسین علی مرزا یحییٰ سے تیرہ ۱۳ سال بڑا تھا دونوں کی مائیں الگ تھیں، خود علی محمد باب نے مرزا یحییٰ کو اپنا

جانشین مقرر کیا نیز اپنا قلم دان اور تمام نوشتہ جات اس کے سپرد کر کے اسے اپنی کتاب بیان کی تکمیل کا حکم بھی دیا (نقطۃ الکاف ص ۲۴۴)

۱۲۶۸ھ سے ۱۲۷۹ھ کے درمیان بغداد بابیوں کا سب سے بڑا مرکز رہا، ان دس گیارہ برسوں میں باب کے ماننے والوں کے اندر اختلافات پیدا ہونے لگے، بہت سے لوگوں نے باب کی پیشنگوئی کے مطابق " من یظہرہ اللہ" ہونے کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا، مرزا حسین علی نے بھی" من یظہرہ اللہ" ہونے کا دعویٰ کیا اور بابیوں کی بہت بڑی تعداد اس کی ہمنوا ہوگئی، پھر دونوں گروہوں میں فسادات اور قتل وغارت گری کا سلسلہ شروع ہوا۔ مرزا حسین علی نے مرزا یحیٰ کو زہر دیکر ہلاک کرنے کی کوشش بھی کی، نیز دوبارہ ایک حجام کو شریک کرکے دوران حجامت گردن کاٹنے کی سازش کی۔ (ہشت بہشت مولفہ حاجی شیخ احمد کرمانی)

ان دونوں گروہوں کی چپقلش سے تنگ آکر دولت عثمانیہ نے ان سب کو بغداد سے استنبول قسطنطنیہ جانے کا حکم دیا وہاں سے ۱۲۸۰ھ میں ادرنہ بھیجا گیا، وہاں بھی ان کے جھگڑے برقرار رہے۔ بالآخر ۱۲۸۵ھ میں مرزا حسین علی بہاء اللہ کو اپنے حامیوں کے ساتھ شام کے علاقہ عکہ میں اور مرزا یحیٰ صبح ازل کو قبرص کے شہر ماغوسا جانے کا حکم دیا گیا۔ واضح رہے کہ عکہ آج کل اسرائیل میں ہے۔

پروفیسر براؤن نے ان ہی دونوں شہروں میں الگ الگ ان دونوں حریف بھائیوں سے ملاقات کی تھی۔ "نقطۃ الکاف" جو علی محمد باب کے مشہور عقیدت مند حاجی مرزا جانی کاشانی کی تصنیف ہے۔ اس کا مقدمہ پروفیسر براؤن نے لکھا ہے اس میں انھوں نے ان دونوں سے ملاقات کی تفصیل بیان کی ہے۔

پروفیسر براؤن کا پہلا سفر ایران ۱۳۰۵ھ میں ہوا۔ جس میں انھوں نے ایران کے مختلف فرقوں شیعہ، بابی اور زرتشتی فضلا سے ملاقات کی اسی سفر میں انھیں بابیوں سے مزید دلچسپی پیدا ہوئی اور ۱۳۰۷ھ میں انھوں نے ماغوسا اور عکہ کے سفر کیے۔ پروفیسر براؤن نے ماغوسا میں اپنے پندرہ دنوں کے قیام اور مرزا یحیٰ سے گفتگو کی تفصیل لکھی ہے اور عکہ کے سفر کی دشواریاں بتائی ہیں، اسی سلسلہ میں بہائیوں کے دستور کے مطابق مرزا حسین علی سے ملاقات کے لیے بیروت، پورٹ سعید یا اسکندریہ سے اس کے ایجنٹ کے ذریعہ اجازت نامہ حاصل کرنے کی کوشش کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ بیروت کے ایجنٹ سے ملاقات نہ ہونے کی وجہ سے تار اور سفارشی خطوط کے ذریعے اجازت نامہ ملا۔ عکہ شہر اور اس کے اطراف کے مناظر، بہاء اللہ کی شاندار رہائش گاہ، اس سے اپنی ملاقات اور گفتگو کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔

۲۔ محترم جلیلی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

" بابی مذہب بہائی مسلک کی اصل اور ثانی الذکر اپنے نظام واعمال کی رو سے اسکی فکری توسیع کی سی حیثیت رکھتا ہے"۔

ہمارے خیال میں بہائی مذہب کو مکمل طور پر بابی مذہب کی فکری توسیع نہیں کہا جا سکتا کیونکہ علی محمد باب نے اپنا جانشین مرزا یحیٰ کو بنایا تھا اور اپنے سے دو ہزار سال بعد ایک " من یظہرہ اللہ" کی پیشنگوئی کی تھی، لیکن حسین علی بہاء اللہ نے باب کے جانشین سے انحراف کر کے خود کو من یظہرہ اللہ کہنا شروع کیا۔ اس نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ بھی کیا (کتاب مبین ص ۵۹ از بہاء اللہ)

اس نے یہ بھی دعوی کیا کہ خدا کی روح اس میں حلول کر گئی ہے (اپی سوڈ آف دی باب ص ۳۵۹) آخر میں اس نے تمام ادیان و مذاہب کے اتحاد کا جھنڈا بلند کیا۔ جبکہ مرزا یحییٰ نے خود کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ حالانکہ اس کے ماننے والے اس کو من یظہرہ اللہ کا مصداق سمجھتے رہے۔

بہاء اللہ کے بعد اس کے بیٹوں عبدالبہاء عباس آفندی اور مرزا محمد علی کے درمیان جانشینی پر اختلاف ہوا۔

غرض ۱۲۶۰ھ سے ۱۳۲۹ھ تک صرف ۶۹ برسوں ہی میں بابی مذہب کے جو حصے بخرے ہوئے اور تمام مذاہب و ادیان کو وحدت کی دعوت دینے والوں کے درمیان ہی جو اختلافات اور قتل و غارت گری کے واقعات رونما ہوئے انھوں نے پروفیسر براؤن کو اس مذہب سے بدظن کر دیا تھا، جس کا اعتراف خود انھوں نے کیا ہے۔ اس طرح سر ڈینیسن کا یہ تبصرہ واقعی باوزن معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر براؤن کی عمر عزیز کے چودہ سال اس تحریک کے پیچھے ضایع ہوئے۔

سلسلۂ تاریخ اسلام

دارالمصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا، اس سلسلہ کی یہ کتابیں موجود ہیں،

تاریخ اسلام حصہ اول (عہد رسالت) قیمت ۵۵ روپیے حصہ دوم (بنوامیہ) قیمت ۴۰ روپیے۔

حصہ سوم (بنی عباس) قیمت ۵۰ روپیے حصہ چہارم (بنی عباس) قیمت ۵۰ روپیے۔

تاریخ دولت عثمانیہ حصہ اول قیمت ۵۵ روپیے، حصہ دوم قیمت ۵۰ روپیے

تاریخ صقلیہ حصہ اول قیمت ۶۰ روپیے۔ حصہ دوم قیمت ۵۰ روپیے۔

ہماری بادشاہی قیمت ۳۰ روپیے۔ **بہادر خواتین اسلام** قیمت ۱۵ روپیے

اسلام میں مذہبی رواداری قیمت ۵۵ روپیے۔

"منیجر"

اخبار علمیہ

ترکی کے فعال تحقیقی ادارہ ریسرچ سنٹر فار اسلامک ہسٹری، آرٹ اینڈ کلچر (IRCICA) نے سنہ ۸۸ء میں 'اسلامی تمدن اور اس کے پیش منظر' کے موضوع پر ایک علمی و تحقیقی سمینار منعقد کیا تھا جس میں اس عنوان کے تحت منہج تحقیق، معلومات و مواد جمع کرکے ان کی منصوبہ بندی، اس کام کے لیے مناسب اور لائق اشخاص کے حصول اور مالیات کی فراہمی کے امکانات پر ماہرین فن محققین نے اپنے بیش قیمت مقالات پیش کیے تھے، جدید عہد میں اسلامی تمدن کے حسن و جمال اور اسکی جامعیت و افادیت پر بعض مقالے نہایت مفید تھے، اب ادارہ مذکور نے "ریسرچ ان اسلامک سویلائزیشن" کے نام سے تیرہ مقالات کو کتابی شکل میں شایع کیا ہے، آغاز میں تعارف کے زیر عنوان موضوع پر ایک سیر حاصل بحث بھی ہے، مقالات کے علاوہ افتتاحی اور اختتامی خطبات اور سمینار کے مباحث اور تجویزوں کو بھی شامل کر دیا گیا ہے، مقالات عربی اور انگریزی میں ہیں اور قیمت ۲۰ ڈالر ہے۔

اسلامی علوم و فنون کی خدمت میں اداروں کے علاوہ بعض افراد کی سعی و کاوش کی خوش آیند و قابل رشک مثالیں بھی سامنے آتی رہتی ہیں، اہل علم ڈاکٹر محمد مصطفی اعظمی کے نام سے واقف ہیں کہ وہ کمپیوٹر میں احادیث نبوی کو داخل کر چکے ہیں، اب معلوم ہوا ہے کہ انگلینڈ میں ایک اور ہندوستانی عالم مولانا مفتی برکت اللہ فقہ اسلامی کو کمپیوٹر میں لانے میں مشغول ہیں اور موطا امام مالک، کتاب الخراج، عمدۃ السالک و عدۃ الناسک متن المحلی، ہدایہ، فتاوی قاضی خاں، فقہ السنہ اور مجلۃ الاحکام العدلیہ جیسی کتابوں کو کمپیوٹر میں لا چکے ہیں،

اس سے پہلے وہ صحاح ستہ کے انگریزی تراجم اور قرآن مجید سے متعلق مضامین اور معلومات کو بھی کمپیوٹر ڈسک پر لا چکے ہیں جس کے لیے دارالعلوم دیوبند اور کیمبرج یونیورسٹی کے یہ فاضل مبارکباد کے مستحق ہیں۔

کمپیوٹر کی تکنیک سے حیرت انگیز کام لیے جا رہے ہیں، اب نیوجرسی کے سائنسدانوں نے دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جس کی مدد سے ۴۵ بلین معلومات کے پرزے ایک انچ میں سما جائیں گے انھوں نے ٹالسٹائی کی ضخیم کتاب 'وار اینڈ پیس' کے دو نسخوں کو سوئی کے ناکہ کے برابر حصہ میں سمیٹنے کا دعویٰ کیا، دقائق کے جمع و تدوین کی یہ کوشش ماہرین کے نزدیک امریکہ اور جاپان کے اب تک تمام تجربات سے کہیں زیادہ فائق و برتر ہے۔

ایسی ہی ایک خبر ٹسکا گو کی ہے، جہاں ایک مشہور کمپیوٹر ساز کمپنی کے چیرمین جان سسولی نے ایک الکٹرونی نمائش میں اعلان کیا کہ ان کی کمپنی جلد ہی نہایت چھوٹے حجم کا ایسا کمپیوٹر بازار میں لائے گی جسے آسانی سے جیب میں رکھا جا سکتا ہے جو استعمال کنندہ کی دستی تحریر کو پڑھنے کے علاوہ ریموٹ کنٹرول کے ذریعہ فیکس بھی بھیج سکتا ہے اور دوسرے کمپیوٹروں سے اطلاعات و معلومات کا تبادلہ بھی کر سکتا ہے۔

انسانی زندگی میں مشینوں اور آلات کے اس عمل دخل سے ممکن ہے بعض لطیف احساسات کچل گئے ہوں، تاہم لذت کام و دہن کی آزمائشیں آج بھی جاری ہیں، گذشتہ دنوں بیجنگ چین میں CLUB DES CHEFSDESCHEFS (CCC) کی کانفرنس ہوئی۔

بادشاہوں، سربراہوں اور صدور و وزرائے اعظم کے میر مطبخوں کی اس انجمن کے بانی صدر فرانس کے میر مطبخ گیلس برگارڈ ہیں، شاہی باورچیوں کی یہ انجمن ہر سال کسی ملک میں اپنے اراکین کو دعوت دیتی ہے، ۹۴ء میں ہندوستان کو شرف میزبانی بخشا گیا ہے۔

جنیوف کو ابھی سے اس کا انتظار ہے، امریکی میر مطبخ ہندوستانی مسالہ دار سالنوں کے گرویدہ ہیں، وہ وہائٹ ہاؤس کی ضیافتوں میں سوپ میں ہندوستانی مسالہ اور دریا میں کھیرے ککڑی کی آمیزش پسند کرتے ہیں لیکن انہیں اس کا افسوس ہے کہ وہ تنور میں تندوری مرغ تیار نہیں کر سکتے، برطانیہ کے شاہی باورچی کام و دہن کو شادکام کرنے کے لیے لندن میں ہندوستانی ریستورانوں میں جاتے رہتے ہیں، ایک بار انھوں نے وزیر اعظم کی دعوت میں چپکے سے ایک ہندوستانی ڈش تیار کر دی تھی لیکن ان سرکاری دعوتوں کے متعلق ان کا نظریہ یہ ہے کہ ان میں سادہ اور ہلکا کھانا ہونا چاہیے، غذا ذہن کو تقویت اور راحت دینے کے لیے ہے نہ کہ محض شکم پری کے لیے، اس لیے ہندوستانی کھانے ان کی نظر میں سرکاری ضیافتوں کے لیے مناسب نہیں۔

اس موقع پر ہندوستان کے راشٹرپتی بھون اور وزیر اعظم ہاؤس کے مطبخ کے نگراں اور میر مطبخ مسٹر سدھیر کے، سیبل نے مرغ مسلم تیار کیا، لیکن حاضرین اس سے اس لیے متاثر نہیں ہوئے کہ انھوں نے اس میں بڑی دیر کی اور مقررہ وقت سے پچیس منٹ زیادہ صرف کیے، بعد میں مسٹر سیبل نے کہا کہ مرغ مسلم کی تیاری میں وہ عجلت پسند نہیں کرتے، چینی باورچیوں نے پکانے کے ہندوستانی طریقہ کو دلچسپی سے دیکھا اور ایک حد تک اسے اپنی طباخی سے قریب تر پایا، دنیا بھر کے تقریباً تیس شاہی باورچیوں میں سلطان برونی کے باورچی شاید تنہا ایسے تھے جو دنیا کے ہر قسم کے کھانے پکانے کے ماہر ہیں، انھوں نے بتایا کہ شاہی دسترخوان پر مسالہ دار شوربے اور چینی کی روٹیاں ہمیشہ موجود رہتی ہیں، فرانسیسی باورچی اور بانی انجمن کی نظر میں دنیا میں صرف تین اقسام کے کھانے لذیذ ترین ہیں، فرانسیسی، چینی اور اپنی ماں کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا، انھوں نے فقرہ چست کیا کہ اگر ماں چینی اور دادی فرانسیسی ہوں تو پھر کیا کہنا۔

(ع۔ص)

معارف کی ڈاک

پروفیسر مختار الدین احمد کا مکتوب گرامی

علی گڑھ۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۹۲ء

مکرمی مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب السلام علیکم

معارف (ستمبر) موصول ہوا۔ کاتب صاحب نے حماسہ ابوتمام کے ترجمے اور اسکی شرح جو دہلی سے مدتوں پہلے شایع ہوئی تھی مسعود حسن مرحوم کی طرف منسوب کردی ہے۔ میں نے ان کے استاد مولانا سید عبدالسبحان دسنوی کے بارے میں لکھا تھا۔

انساب عرب پر مصعب بن عبداللہ الزبیری اور ابن حزم دونوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ لیوی پروفنسال نے ابن حزم کی نہیں (جیسا کہ میں نے لکھا ہے) مصعب الزبیری کی کتاب شایع کی ہے، ابن حزم کی عبدالسلام ہارون نے۔ دونوں کتابیں قاہرہ سے چھپی ہیں، وجہ اشتراک موضوع اور مقام اشاعت تھی، حافظے نے محمود کی پگڑی احمد کے سر پر رکھ دی۔

الزبیری کی اس موضوع پر دو کتابیں بتائی جاتی ہیں، ایک تو یہی جسے پروفنسال نے شایع کی، دوسری کتاب نسب قریش واخبارہم ہے جو اب تک شایع نہ ہوسکی۔ اس کا نسخہ برٹش میوزیم میں ہے، میں نے اوکسفورڈ کی ڈاکٹریٹ کے لیے جن موضوعات کا انتخاب کیا تھا ان میں یہ کتاب بھی تھی۔ اسے اڈٹ کرنا چاہتا تھا لیکن پروفیسر گب کی رائے ہوئی کہ خالص عربی ادب کے کسی مخطوطے کا انتخاب کرنا چاہیے، چنانچہ الشیزری کی جمہرۃ الاسلام ذات النثر والنظام کا (جس کا صرف ایک ہی نسخہ دنیا میں لائیڈن۔ ہولینڈ

میں محفوظ ہے) انتخاب عمل میں آیا۔

اسی موضوع پر الزبیر بن بکار کی کتاب نسب قریش واخبارہم ہے۔ یہ اوکسفورڈ کے بوڈلیان لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس کا عکس اپنے انگلستان کے قیام کے زمانے میں پروفیسر ابو محفوظ الکریم معصومی صاحب (کلکتہ) کی طلب پر انہیں بھیج دیا تھا۔ بڑا خوبصورت اور بہت حد تک صحیح نسخہ ہے۔ لیکن یہ کتاب کا صرف ایک حصہ ہے، معصومی صاحب کتاب کے دوسرے حصے کے "ظہور" کے انتظار میں رہے۔ میں نے انہیں لکھا کہ اب اس حصے کو شایع کردیجئے پھر دیکھا جائے گا۔ یقین ہے انھوں نے اس پر بہت کچھ کام کرلیا ہوگا۔ یاد آتا ہے کہ اب ترکی یا کہیں اور اس کتاب کے دوسرے حصے کا بھی انکشاف ہوگیا ہے۔

ابن الکلبی کی الجمہرۃ فی النسب اس موضوع کی اہم کتابوں میں ہے۔ اس کے نسخے اسکوریال، لندن اور پیرس میں محفوظ ہیں، اس کے خلاصے ابوسعید السکری (متوفی ۲۷۵ھ) اور یاقوت الحموی (متوفی ۶۲۶ھ) نے تیار کیے ہیں۔ السکری کے خلاصے کی پہلی جلد برٹش میوزیم میں ہے اور یاقوت کے کیے ہوئے اختصار المقتضب من جمہرۃ النسب کا نسخہ منحصر بفرد دارالکتب قاہرہ میں محفوظ ہے، یہ نسخہ یاقوت کی زندگی میں سنہ ۶۲۱ھ میں لکھا گیا ہے۔ میرے مرحوم دوست ڈاکٹر احسان الٰہی رانا (اورینٹل کالج لاہور) کو ابن الکلبی کی الجمہرۃ سے دلچسپی کیمبرج کے قیام کے دوران ہوئی۔ انھوں نے لاہور واپس جاکر اسے مرتب کرکے اورینٹل کالج میگزین میں شایع کرنا شروع کیا (اگست ۱۹۵۹۔ فروری ۱۹۶۳) المقتضب من جمہرۃ النسب از یاقوت الحموی کی جلد اول کا نصف ثانی اپنے حواشی کے ساتھ اسی رسالے کے شمارہ خاص (۱۹۸۲) میں ۹۴ صفحوں میں شایع کیا ہے۔ ممکن ہے

ؔلہ پڑھا نہیں گیا، کتب خانہ خدیویہ میں بھی مخطوطہ موجود ہے۔ (فہرست ج ۵ ص ۱۵۶) (معارف)

کچھ قسطیں اور بھی شایع ہوئی ہوں اور میری نظر سے نہیں گزری ہوں۔ افسوس ہے کہ ابن الکلبی کی یہ تصنیف وہ کتابی شکل میں شایع نہ کرسکے۔

ڈاکٹر احسان الہٰی انگلستان میں میرے معاصر تھے۔ میں اوکس فورڈ میں پروفیسر گب کی نگرانی میں کام کر رہا تھا اور وہ کیمبرج میں پروفیسر آربری کے تحت یاقوت الحموی پر علمی مقالہ لکھ رہے تھے جس پر انھیں ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی۔ یہ کتاب لاہور سے شایع ہوگئی ہے۔ وہ محنت کرنے والے اور علم کے شائق تھے، عربی ادب اور اسلامیات پر بہت اچھی نظر رکھتے تھے، سنجیدہ، متواضع اور دوست نواز آدمی تھے۔ ۱۹۵۲ء میں میری فرمایش پر انھوں نے اپنا علمی کام روک کر ایک شاعر کا دیوان (جس کا قلمی نسخہ صرف کیمبرج میں محفوظ ہے)، اپنے ہاتھ سے نقل کر کے مجھے بھیج دیا۔ واپسی کے بعد وہ اورینٹل کالج میں عربی کے لکچرر ہوئے۔ وہ پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ عربی کے صدر ہو کر متقاعد ہوئے اور لاہور ہی میں مقیم رہ کر وہ اپنے علمی و ادبی کاموں میں مصروف تھے کہ چند ماہ پہلے پروفیسر محمد اسلم (شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی) کا خط آیا کہ ڈاکٹر صاحب لاہور میں وفات پاگئے۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی تربت ٹھنڈی رکھے۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام

مختار الدین احمد

مکاتیب شبلی حصہ اول و دوم

اس کا پہلا حصہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو علامہ شبلیؒ نے اپنے معاصرین اور احباب کو لکھے تھے دوسرے حصے میں شاگردوں اور عزیزوں کے نام کے خطوط درج ہیں جن سے اس دور کی مختلف علمی تعلیمی اور قومی سرگرمیوں کا حال معلوم ہوتا ہے۔ قیمت حصہ اول ۴۰ روپیے، حصہ دوم ۳۰ روپیے۔

"منیجر"

وفیات

آہ! جناب حکیم عبدالقوی دریابادی مرحوم

جناب حکیم عبدالقوی دریابادی کے انتقال کی خبر دارالمصنفین میں نہایت غم و اندوہ کے ساتھ سنی گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

وہ جنوری ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے تھے، اب ۹، برس کی حیات مستعار کے بعد جب انھوں نے رخت سفر باندھا تو محسوس ہوا کہ علم، ادب، صحافت اور طبابت ہی نہیں شرافت، مروت، وضعداری، سادگی، فروتنی اور عجز و انکسار کا ایک پیکر مجسم رخصت ہوگیا۔

مرحوم دریاباد کے اس معزز قدوائی خاندان کے چشم و چراغ تھے، جس کو دینداری، علم و فضل اور طب و حکمت میں غیر معمولی امتیاز حاصل تھا اس خانوادے کے جد امجد خواجہ محمد آبکش، مفتی مظہر کریم اسیر انڈمان و صاحب فتاویٰ مظہریہ و مترجم مراصد الاطلاع اور شفاء الملک محسن طب حکیم عبدالحسیب دریابادی کے سلسلۃ الذہب کی سب سے روشن و تابدار کڑی مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ذات گرامی تھی جو اردو ادب کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے، حکیم صاحب مولانا مرحوم کے داماد اور ان کے بڑے بھائی عبدالمجید صاحب مرحوم ڈپٹی کلکٹر کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے، ڈپٹی صاحب نیک نام سرکاری عہدیدار ہونے کے علاوہ علم و ادب اور شعر و سخن کا بھی ستھرا اور اعلا ذوق رکھتے تھے۔

حکیم صاحب والد سے زیادہ اپنے نامور عم محترم کی تربیت اور سایۂ عاطفت میں رہے، دس برس کی عمر میں حفظ قرآن مجید کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کے بعد عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی، عربی ادب کی تعلیم انھوں نے مولانا خلیل عرب سے حاصل کی جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بھی استاذ تھے، دونوں بزرگوں کے درمیان رشتۂ اخوت و محبت کا آغاز اسی ہمدرسی کے زمانہ میں ہوا جو تمام عمر اس طرح استوار رہا کہ حکیم صاحب کی نماز جنازہ مولانا مدظلہ نے ہی پڑھائی، حکیم صاحب نے پنجاب اور لکھنؤ یونیورسٹی سے منشی فاضل، مولوی فاضل، عالم اور بی اے کی سندیں بھی حاصل کیں، ابتداءً شفاءالملک حکیم عبدالحبیب، حکیم شمس الدین اور ڈاکٹر عبدالعلی حسنی وغیرہ سے طب و حکمت کا درس لیا پھر حکیم اجمل طبیہ کالج دہلی سے فاضل الطب والجراحت کی سند لی۔

حکیم صاحب طب میں ذی کمال تھے ان کی حذاقت و مسیحائی کا اعتراف مریضوں کے علاوہ نامور اہل فن کو بھی تھا، مدۃ العمر طب کے پیشہ سے وابستہ رہنے کے باوجود حکیم صاحب نے اس کو کبھی وسیلہ معاش نہیں بنایا، ان کا اصل شغل بلکہ پیشہ صحافت تھی، مسلم لیگ کے اخبار تنویر کے مدیر ہونے کے علاوہ حق، قائد، ندائے ملت اور سیاست جدید کے اداریے برابر وہی لکھتے رہے، ملک و ملت کے علاوہ بین الاقوامی مسائل پر ان کے اداریے اور تعلیقات بہترین صحافت کا نمونہ ہوتے تھے، ان اخباروں کے متعدد کالم اور صفحات انہی کی تحریروں سے مزین رہتے تھے مگر اس میں بھی وہ پیشہ ور صحافیوں سے ممتاز تھے، نہ نام و نمود اور شہرت کے کبھی طالب ہوئے اور نہ اپنے حق المحنت کا کبھی مطالبہ کیا، واجبات پر انھوں نے کبھی توجہ نہیں کی، حرص و آز کے اس دور میں مالی حساب و کتاب سے ایسی بے نیازی کی مثال کہاں ملے گی، ان کی اصل جولانگاہ و دو کا مرکز

"صدق" تھا جس کی طباعت و اشاعت اور اہتمام و انصرام سے لے کر صدق بک ایجنسی کے تمام مسائل و امور کو وہ تنہا انجام دیتے تھے، مراسلت، اخبار کی کتابت، پریس اور ڈاکخانہ کے دشوار گزار مراحل، ہفتہ وار اخبار کی متعین وقت پر اشاعت اور ان سب کے ساتھ بلا ناغہ ہر جمعہ کو دریاباد جاکر ہفتہ کی صبح کو لکھنؤ واپس آنے کا معمول حکیم صاحب جس خاموشی اور استقلال کے ساتھ نبھاتے رہے اس کا یقین ان کے جیسے بظاہر کمزور، نحیف اور خاموش وجود کو دیکھتے ہوئے کسی شخص کو مشکل ہی سے آئے گا۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے انتقال ۱۹۷۷ء کے بعد صدق کی ادارتی ذمہ داری بھی ان پر آگئی اور جب تک خود ان کی شام زندگی کے دھندلکے گہرے نہیں ہوگئے وہ خوش اسلوبی سے صدق کی روایت و وراثت کو زندہ کیے رہے، اپنے عم محترم مولانا دریابادی کے مخصوص طرز ادب و انشا کو اپنانے میں گو وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے تاہم انہی کی طرح اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت سے عشق و شیفتگی اور مغرب و مغربی تہذیب سے بیزاری اور نفرت ان کی بھی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی اور مولانائے مرحوم کی طرح مشرقی تہذیب و تمدن کی برتری کے اعتراف میں کبھی مداہنت سے کام نہ لیتے، حق کی حمایت اور باطل کے رد و احتساب میں وہ مولانا کا ثنیٰ تھے، مولانا کی زندگی ۱۹۷۵ء ہی میں حکیم صاحب کے قلم سے پہلی بار "سچی باتیں" نکلیں جو اللہ اکبر کے دو لفظی فقرہ کی معنویت و تاثیر سے متعلق تھیں، اگر ان کا نام درج نہ ہوتا تو ان سچی باتوں اور مولانا مرحوم کی سچی باتوں کے طرز تحریر کا فرق دشوار ہو جاتا، ان کے چھوٹے چھوٹے شذرات و تعلیقات کے عنوان بھی خالص ماجدی رنگ کے ہوتے جنکی رعایت لفظی اور ضلع جگت اکثر بڑی پرلطف ہوتی، مثلاً ڈاک کے ڈاکو، زنانہ ڈاکخانہ، زن راہزن، شراب نذر آب،

ملاوٹ کی گراوٹ، ویٹ نام کی جنگ خون آشام، شب قدر کی قدر وغیرہ، ایک بار خبر آئی کہ اب لکھنؤ کی سڑکوں پر تانگے نہیں چلیں گے، اس پر انھوں نے تبصرہ کرتے ہوئے سرخی دی "تانگے بھی چلے" کسی مسلمان کا انتقال اگر نماز پڑھتے یا حج کرتے یا کوئی اور عمل خیر انجام دیتے ہوئے ہوتا تو وہ ضرور اس کے حسن خاتمہ، خوش نصیبی اور عاقبت بخیر ہونے کا ذکر کرتے، سچی باتوں کے علاوہ کتابوں پر انکے تبصرے ان کے وسیع مطالعہ کے غماز ہوتے۔ صحافتی زندگی نے ان کو تصنیف و تالیف کے لیے مطلوب یکسوئی اور وقت نہیں دیا، تاہم اپنے والد کے حالات پر انھوں نے ایک چھوٹی سی کتاب ذکر مجید مرتب کی۔ ادارۂ فروغ اردو نے جس کے ترجمان رسالہ فروغ اردو کے بھی وہ مدیر رہے ان کی کچھ کتابیں شایع کیں لیکن ان کی حیثیت نصابی کتابوں کی شرح کی سی ہے جیسے شرح تمنائے خیام، شرح مفتاح العربیہ، شرح سلک گہر وغیرہ، علامہ اقبال کے وہ شیدائی تھے، چنانچہ ایک کتاب فلسفہ اقبال لکھی، علی گڑھ کے رسالہ تہذیب الاخلاق کے نومبر کے شمارہ میں ان کی ایک تحریر شایع ہوئی ہے جو شاید ان کی سب سے آخری تحریر ہو، یہ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کے متعلق ہے اور عنوان ہی ہے 'جن سے میں نے اردو سیکھی' اس میں انھوں نے بڑی صراحت سے لکھا کہ فلسفہ اقبال کا بیشتر حصہ 'اقبال کامل' سے مستعار ہے، 'اقبال کامل' کو وہ اقبال کی شاعری، پیام اور فلسفہ پر حرف آخر سمجھتے تھے، مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم اور علامہ شبلیؒ سے ان کو بڑی عقیدت تھی اور دارالمصنفین کے ہر ہر فرد سے محبت کرتے تھے اور اس سے شایع ہونے والی کتاب کو پسند کرتے تھے، اپنے عم محترم کے ساتھ وہ یہاں کئی بار آئے، ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین پر سمینار ہوا تو خرابی صحت

کے باوجود اپنے بھائی جناب حبیب احمد قدوائی کے ساتھ تشریف لائے، اور صدق کے دو نمبروں میں اپنا سفرنامہ لکھا، جس کی سطر سطر سے ان کی محبت و شفقت کی خوشبو آتی ہے، انتقال سے شاید کچھ ہی دن پہلے انکا والا نامہ جناب ضیاءالدین صاحب کے نام آیا جس میں "سوئے حرم" کے متعلق لکھا کہ وہ اسے بڑی دلچسپی سے پڑھ رہے ہیں، ادھر عرصہ سے ان کی خواہش تھی کہ محمد علی ذاتی ڈائری کو دارالمصنفین پھر سے شایع کرے۔

کثرت مطالعہ اور کتب بینی سے ان کو خاص شغف تھا، چند ماہ قبل لکھنؤ ان کی خدمت میں آخری بار حاضر ہوا تو معارف کے ایک مضمون کے علاوہ مولانا عتیق الرحمن سنبھلی کی نئی کتاب سانحہ کربلا پر دیر تک گفتگو فرماتے رہے، ادھر خدابخش لائبریری نے طلسم ہوشربا کا جدید اڈیشن کئی جلدوں میں شایع کیا ہے انھوں نے ضعفِ بصارت کے باوجود اس کے مطالعہ کے لیے محترم الحاج منظور علی لکھنوی کو کلکتہ لکھا کہ یہ جلدیں ان کو بھیج دی جائیں، جس دن یہ کتابیں ان کی خدمت میں روانہ کی جانے والی تھیں اسی دن وہ خود اس طلسم آب و گل سے نکل چکے تھے۔

وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، انڈین بورڈ آف یونانی میڈیسن اور انجمن اصلاح المسلمین کی انتظامی مجالس کے رکن بھی تھے، یوپی اردو اکادمی کے بھی وہ ممبر رہے۔

نماز روزہ کے پابند تھے، حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے، سیاست جدید میں ان کا سفرنامۂ حج مستقل شایع ہوتا رہا، ان کی اہلیہ محترمہ نے ایک عمدہ سفرنامۂ حج لکھا جو خواتین کے رسالہ حریم لکھنؤ میں شایع ہوا، قرآن مجید بہت اچھا یاد تھا، عرصہ تک وہ تراویح میں قرآن مجید سناتے رہے، حفظ کی برکت سے ان کا حافظہ بھی قوی تھا، برسوں پرانے واقعات اور سنین ان کو اچھی طرح یاد رہتے اور انہیں وثوق کیسا تھ

بیان کرتے، وہ ایک معصوم اور فرشتہ صفت انسان معلوم ہوتے تھے، ان کا عرفی اور گھریلو نام آفتاب تھا اور حق یہ ہے کہ وہ شرافت، مروت، خدمت اور استغنار کا مجسم آفتاب تھے، ایسے بے غرض، بے ریا، بے ضرر اور مکارم اخلاق سے آراستہ انسان کو دیکھنے کے لیے اب آنکھیں ترسیں گی، صبر و تحمل کا پیکر تھے، ان کو بعض شدید مالی اور ذہنی صدمے پہنچے مگر انہیں خاموشی سے برداشت کر لیا اور زبان پر حرف گلہ یا اپنوں اور غیروں کسی کے سامنے اس کا ذکر بھی نہ آنے دیا، خوراک و پوشاک میں انکی سادگی اور بے پروائی ضرب المثل کی حد تک مشہور ہوئی، سفر میں انکی شیروانی ہی انکا اوڑھنا بچھونا بن جاتی، سفر انھوں نے کثرت سے کیے جس میں راہ کی صعوبتیں کبھی مانع نہ ہوئیں۔ چند کتابیں اور اخبارات ہی ان کا زاد سفر ہوتا، میزبانوں کے لیے ان سے زیادہ عافیت بخش مہمان ملنا مشکل ہے، چائے ان کے لیے آب حیات سے کم نہ تھی، ایک اور شوق کرکٹ کا تھا، نوجوانی میں کھیلنے کا اور بعد میں دیکھنے کا، ٹسٹ میچ دیکھنے کے لیے وہ ایک بار لاہور بھی گئے، اس برصغیر کے کرکٹ کے مشہور کھلاڑی جہانگیر خاں، صدق اور مدیر صدق کے بڑے قدرداں تھے، حکیم صاحب نے ایک بار بتایا کہ انھوں نے اپنے بیٹے کا نام عم مرحوم کے نام پر ماجد خاں رکھا، یہی ماجد خاں بعد میں بڑی شہرت کے مالک ہوئے، اپنے اداراتی کالموں میں وہ کرکٹ کے اہم میچوں پر ضرور تبصرہ کرتے جس سے اس کھیل کی باریکیوں اور اس کے ہر ہر پہلو سے ان کی واقفیت کا اندازہ ہوتا۔

پس ماندگان میں ان کی اہلیہ محترمہ کے علاوہ تین بھائی، حبیب احمد قدوائی، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی سابق ایم پی اور عبدالعلیم قدوائی ہیں، لاولد تھے لیکن بھتیجوں اور بھانجوں کی موجودگی نے اس محرومی کا احساس کبھی نہ ہونے دیا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ

ان سب کو صبر جمیل کی توفیق دے اور اپنے اس فرشتہ خصلت بندہ کو جنت الفردوس میں اپنی قربت کی نعمت سے نوازے۔

(ع۔ص)

آہ! مولانا حامد الانصاری غازی

۱۶/ اکتوبر ۱۹۹۲ء کو مولانا حامد الانصاری غازی نے داعی اجل کو لبیک کہا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن، وہ جمعیۃ علمائے ہند کی تنظیم سے وابستہ اور گذشتہ ۲۴ برسوں سے بمبئی میں رہ کر، علم، دین، ادب اور صحافت کی خدمت میں مصروف تھے۔

غازی صاحب کا وطن دیوبند تھا اور وہ ایک ممتاز علمی و دینی گھرانے کے چشم و چراغ تھے، ان کے دادا مولانا عبداللہ انصاری، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دیوبند کے داماد اور علی گڑھ محمڈن اینگلو کالج میں شعبۂ دینیات کے ناظم تھے، ۱۸۹۲ء میں ندوۃ العلما کی تحریک کا غلغلہ بلند ہوا تو انھوں نے اس میں بھی حصہ لیا، انکے چھوٹے صاحبزادے مولانا محمد میاں منصور غازی تحریک آزادی کے پرجوش مجاہد اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے جو ریشمی رومال کی تحریک میں پیش پیش رہے اور جب شیخ الہند کے ایما سے صوبہ سرحد میں آزاد ہندوستان کی جلاوطن حکومت قائم ہوئی تو یہ اس کے وزیر داخلہ بنائے گئے، اس حکومت کے صدر مہارا ناپرتاب سنگھ، وزیر اعظم مولانا برکت اللہ بھوپالی اور وزیر خارجہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ تھے۔

مولانا محمد میاں منصور نے تحریک کی ناکامی کے بعد بھی افغانستان کی سکونت ترک نہیں کی اور اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔ ان کی اولاد و احفاد نے بھی افغانستان میں مستقل بود و باش اختیار کر لی، صرف مولانا حامد الانصاری ہندوستان میں متوطن

ہوئے اور بمبئی کو اپنی جدوجہد کا میدان بنایا۔

غازی صاحب کا سلسلۂ نسب میزبانِ رسول حضرت ابوایوبؓ انصاری سے ملتا ہے، ہندوستان میں ان کے مورثِ اعلیٰ شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہروی تھے، جن سے خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم کا بھی خاندانی تعلق تھا۔

مولانا حامد الانصاری کی ولادت ۱۹۰۰ء میں دیوبند میں ہوئی، ابتدائی تعلیم دارالعلوم معینیہ اجمیر میں ہوئی اور فراغت دارالعلوم دیوبند سے ہوئی، ان کے اساتذہ میں مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا محمد ابراہیم بلیاوی اور مولانا اعزاز علی صاحب جیسے ممتاز اصحاب علم وفن شامل ہیں، مولانا سید حسین احمد مدنی سے گو رسماً تعلیم نہیں پائی تاہم ان سے بھی بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ غازی صاحب نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے منشی فاضل کا امتحان بھی پاس کیا تھا۔

ان کی طبیعت کا میلان صحافت کی جانب تھا جس کا چسکہ بچپن ہی سے لگ گیا تھا، طالب علمی کے زمانہ میں کئی قلمی رسالے نکالے، دیوبند سے ان کی ادارت میں بعض ہفت روزہ اخبار بھی نکلے مگر صحافت کے مطلع پر وہ اس وقت زیادہ چمکے جب دیوبند سے باہر قدم نکالا، پہلے الجمعیۃ دہلی اور مدینہ بجنور سے منسلک ہوئے، کچھ دنوں تک مولانا تاجور نجیب آبادی کے ماہنامہ "ادبی دنیا" سے بھی وابستہ رہے، پھر مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کے ترجمان ندائے حرم دہلی کے مدیر ہوئے، ۱۹۴۵ء میں مدینہ بجنور کی ادارت دوبارہ سنبھالی اور چیف اڈیٹر ہوئے، ۱۹۴۸ء میں جمہوریت کے اڈیٹر ہو کر بمبئی تشریف لائے جو ۱۹۵۶ء تک روزنامہ اور اس کے بعد ۱۹۶۲ء تک ہفتہ وار رہا، بمبئی سے جب روزنامہ اردو ٹائمز جاری ہوا تو شروع میں اسکے

اداریے انہیں نے لکھے، اس کا یہ نام انہی کا تجویز کیا ہوا تھا، بمبئی سے بعض اور اخبار اور رسالے بھی ان کی نگرانی اور سرپرستی میں شایع ہوئے، ندوۃ المصنفین سے شایع ہونے والا ماہنامہ برہان دہلی بھی ان کی نگارشات سے متمتع ہوتا رہا ہے اس کے علاوہ بھی متعدد اخبار اور رسالوں میں ان کے مضامین چھپے، ان کی صحبت و تربیت میں رہکر جن لوگوں کے صحافتی جوہر چمکے ان کی طویل فہرست ہے۔

غازی صاحب مرحوم ندوۃ المصنفین دہلی کے اعزازی رفیق تھے جہاں سے انکی کتاب "اسلام کا نظام حکومت" شایع ہوئی جو اپنے موضوع پر اردو زبان میں ایک منفرد کتاب ہے، پتہ چلا ہے کہ ان کے صاحبزادے طارق غازی صاحب نے اسکا انگریزی ترجمہ بھی کیا ہے، جو عنقریب طبع ہونے والا ہے، غازی صاحب کی چند اور کتابوں کے نام یہ ہیں۔

خلقِ عظیم (سیرت میں)، جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ، تجرید البخاری، تذکرہ مولانا انور شاہ کشمیری۔

غازی صاحب مدۃ العمر جمعیۃ علمائے ہند سے وابستہ رہ کر دین وملت اور قوم و وطن کی خدمت کرتے رہے۔ ایک مدت تک دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی رہے۔ پورٹ حج کمیٹی بمبئی اور حکومت ہند و حکومت مہاراشٹر کی بعض کمیٹیوں کے رکن رہے۔ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے بنیادی ارکان میں تھے، انجمن خیر الاسلام بمبئی، مہاراشٹر کالج بمبئی اور کئی تعلیمی اداروں سے بھی ان کا تعلق تھا، بمبئی کی جس بزم میں وہ پہنچ جاتے اس میں رونق محفل وہی ہوتے، تحریر کی طرح تقریر کا بھی ان کو اچھا ملکہ تھا، دوسرے مقررین انکے بعد

مائک پر آنے میں گھبراتے تھے۔

غازی صاحب کی پہلی بیوی میمونہ خاتون سے عابد الانصاری غازی تولد ہوئے جو شکاگو یونیورسٹی میں پروفیسر اور اقرأ فاونڈیشن کے نام سے اسلامک مشن چلا رہے ہیں، دوسری بیوی ہاجرہ نازلی، مولانا محمد طیب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی صاحبزادی اور اردو کی ناول نگار ہیں، ان کے بطن سے چار بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئیں۔ ان میں طارق غازی اردو انگریزی کے اچھے صحافی اور سعودی گزٹ جدہ کے مدیر ہیں، خالد غازی، راشد غازی اور سلمان غازی بھی اچھی ملازمتوں پر فائز ہیں، صاحبزادی شہناز کنول کا میلان اپنی والدہ کی طرح ناول نگاری کی طرف ہے۔ یہ سب اپنے علمی و خاندانی روایات کو اپنائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مولانا حامد الانصاری غازی کو جنت الفردوس نصیب کرے آمین۔

دار المصنفین کا سلسلۂ وفیات

یاد رفتگاں: یہ کتاب حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ان غمناک تحریروں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے اساتذہ، شیخ طریقت، احباب، معاصرین اور دوسرے مشاہیر علم و فن، ارباب شعر و ادب اور دوسرے طبقوں کے ناموروں کی رحلت پر لکھی تھیں۔

قیمت ۵۰ روپیے۔

بزم رفتگاں حصہ دوم: یہ کتاب جناب سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم کی ان ماتمی تحریروں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے دور میں وفات پانے والے ارباب علم و دانش کے بارے میں لکھی تھیں۔

قیمت ۳۵ روپیے

مطبوعات جدیدہ

کیفی اعظمی، عکس اور جہتیں مرتبہ از جناب شاہد ماہلی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ، کتابت و طباعت مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۵۳۰، قیمت ۲۰۰ روپیے۔

ناشر: معیار پبلی کیشنز، ۲۰۰ سی، شیخ سرائے، فیز ۲ نئی دہلی، ۱۷۔

عہد جدید کے ترقی پسند اردو شعرا میں جناب کیفی اعظمی کا نام محتاج تعارف نہیں، وہ اعظم گڈھ کے ایک شریف اور زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے، جس کے ماحول میں ان کو شعر و سخن کا ستھرا ذوق ورثہ میں ملا، لکھنؤ میں حصول تعلیم کے دوران مولانا صفی لکھنوی اور بعض دوسرے ممتاز شعرا کی بزم کمال میں حاضری سے ان کی شاعری کو جلا ملی، کیفی صاحب کے کلام کے متعدد مجموعے شایع ہوچکے ہیں اور وہ کئی اعلیٰ ادبی انعامات سے سرفراز بھی ہوئے ہیں، اپنے خاص سیاسی فکر و مسلک اور اردو شاعری کے روایتی مزاج و انداز سے انحراف کے باوجود، لہجہ کے جوش، نفس گرم کی تندی اور گرد و پیش پر ان کی گہری نظر نے ان کی شاعری کو انفرادی حیثیت دی ہے، ترقی پسندی کے باوجود ان کے کلام میں انیس و شبلی و اقبال کا شائستہ اور پراثر آہنگ بھی ہے، ان کا ایک مجموعہ کلام جب کچھ بے احتیاطیوں کی وجہ سے معرض بحث بنا تو انھوں نے ضد اور ہٹ دھرمی کے بجائے نرم و شائستہ علمی زبان استعمال کی، شاید اسی لیے یہ کہا گیا کہ "ان کو محض بعض اشعار کی بنیاد پر مذہب بیزار نہیں کہا جا سکتا"، زیر نظر کتاب میں ان کی شخصیت و شاعری پر کئی ممتاز اہل قلم کے مضامین و تاثرات یکجا

کر دیے گئے ہیں، جن سے کیفی اعظمی صاحب کے سوانح، حالات کے نشیب و فراز، انکی شاعری کے مختلف ادوار اور اس کے بلند و پست مقامات سے واقفیت ہوجاتی ہے، ان کی شخصیت پر ان کی تحریک حیات کا مضمون اور شاعری پر خلیل الرحمٰن اعظمی کی ایک مختصر تحریر اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا مضمون خاص طور پر مطالعہ کے قابل ہے، چند اہم تصویریں اور مصور صادق کے کچھ اسکیچ بھی شامل ہیں جنھیں بعض نظموں کے 'بصری پیکر' سے تعبیر کیا گیا ہے، طباعت خوبصورت ہے لیکن کتابت کی غلطیاں بہت ہیں، جیسے رافت کی جگہ مرافت، ارتکاز کی جگہ ارتقاز، قدغن کو قدظن، قنوطی کو قنوعی، حواس خمسہ کو حواس خیمہ، ہزیمت کو حزیمت اور معاصرین کو محاصرین لکھ دیا گیا ہے، حسن زن کو حسن ظن اور ھل من مزید کو نعل من عزیز سے بدل دیا گیا ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسائل کا شرعی حل

از جناب مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، تقطیع متوسط، عمدہ کاغذ، کتابت و طباعت، صفحات ۴۲۲، قیمت درج نہیں، پتہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹، لکھنؤ۔

زیر نظر کتاب فاضل مصنف کے ان متفرق مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف رسالوں میں وقتاً فوقتاً شایع ہوتے رہے ہیں، اس میں کئی جدید اور اہم مسائل زیر بحث آئے ہیں مثلاً، سود، انشورنس، حکومتی قرضے، پراویڈنٹ فنڈ، نیشنلائزیشن، کمپنی کے شیئر، یونٹ ٹرسٹ میں رقم، ٹسٹ ٹیوب کے ذریعہ اولاد، انسانی خون کی خرید و فروخت، اعضاء کی پیوندکاری، پوسٹ مارٹم، عورتوں کی ملازمت، سول میرج وغیرہ، ان کے علاوہ ہوائی جہاز میں نماز اور قبلہ کا مسئلہ، قطبین میں نماز روزہ

کے اوقات اور وہاں چاند کی تاریخ کا تعین، مصارف زکوٰۃ میں فی سبیل اللہ کا تعین اور عموم مشینی ذبیحہ، جہیز، حق تصنیف و تالیف وغیرہ پر بھی مفید بحث کی گئی ہے۔ گو ان مسائل پر متعدد اہل علم لکھتے رہے ہیں تاہم فاضل مولف تیس برس سے حدیث و فقہ کے مطالعہ اور درس و تدریس میں مشغول ہیں اور فقہ حنفی پر ان کی اچھی نظر ہے اور مختلف فقہی موضوعات پر ان کی بعض مفید کتابیں اردو میں چھپ گئی ہیں جن میں سے بعض کے عربی ترجمے بھی ہوئے ہیں، فاضل مولف کے نزدیک ہر جدید کو شرعاً قابل قبول بنانے کے لیے زیادہ زور صرف کرنا اور معمولی اسباب کی وجہ سے ان کو ناجائز کہہ کر رد کر دینا دونوں ہی نامناسب ہے، تجدد خطرناک ہے تو تشدد بھی مضرت رساں ہے، اس بنا پر انھوں نے کتاب و سنت میں موجود گنجایش کی صورت میں امت کی سہولت کے خیال سے بعض نئے مسائل کو جائز بتایا ہے، اعضاء کی پیوندکاری، عورتوں کی ملازمت، خون کا عطیہ وغیرہ کے متعلق ان کی رائے بعض ممتاز اہل علم سے مختلف ہے، تاہم ان کا نقطہ نظر دلائل اور دوربینی سے خالی نہیں ہے، اعضاء کی پیوندکاری کے متعلق انھوں نے اسلامی فقہ اکیڈمی کی قرارداد کو حکمت عملی پر مبنی بتایا ہے، جس پر ہم کو بھی حیرت ہے۔

اذان خطبہ کا صحیح محل

از جناب مولوی بدر احمد مجیبی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ، کتابت و طباعت، صفحات ۱۳۵، قیمت ۱۵ روپیے، پتہ: دانش کدہ، پھلواری شریف، پٹنہ، بہار۔

پھلواری شریف کی خانقاہ مجیبیہ علم و عرفان دونوں میں ممتاز ہے۔ اس کے دار الافتا سے جاری ہونے والے فتوے اعتدال و توازن پر مبنی ہوتے ہیں گذشتہ دنوں وہاں کے ایک فتویٰ میں یہ بتایا گیا تھا کہ جمعہ کی اذان ثانی یا اذان خطبہ کا صحیح مقام مسجد کے

اندر ہے، اس کی تردید میں کئی تحریریں سپرد قلم کی گئیں جن میں نفس مسئلہ سے عدم توجہ کے علاوہ طنز و تشنیع سے بھی کام لیا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں ان تحریروں اور دلائل کا جائزہ عمدہ علمی انداز میں لیا گیا ہے اور فقہ حنفی کی رو سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اذان ثانی اعلام غائبین کے لیے نہیں دی جاتی بلکہ اس کا مقصد حاضرین مسجد کو خطبہ سننے کے لیے خاموش و متنبہ کرنا ہوتا ہے اس لیے اسے مسجد کے اندر ہی ہونا چاہیے یہی فقہاء کا مسلک اور امت کا معمول رہا ہے، لائق مولف ابھی نوعمر ہیں، لیکن ان میں مصادر سے استنباط اور اخذ ادلہ کی اچھی صلاحیت ہے، ان کا طرز افہام و تفہیم دلنشین اور مناظرانہ انداز سے خالی ہے۔ کہیں کہیں برموقع طنز بہت پرلطف ہے۔

اصلاحی مضامین از مولانا محمد عمران خاں ندوی ازہری مرحوم،

چھوٹی تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۰۴، قیمت ۱۵ روپئے

پتہ: دار التصنیف والترجمہ، ۱۳۔ مسجد شکور خاں روڈ، بھوپال، ایم۔ پی۔

مولانا محمد عمران خاں ندوی مرحوم کی شہرت ان کی نظم و ضبط کی پابندی، غیر معمولی انتظامی صلاحیت اور ان کے دلچسپ اور دلنشین وعظ و خطبات کی وجہ سے ہے لیکن ان میں اچھا علمی، ادبی اور تحریری ذوق بھی تھا، اس کا ثبوت ان کے وہ مضامین ہیں جو وقتاً فوقتاً ان کے قلم سے نکلے، زیر نظر کتاب ان کے ایسے ہی چند اصلاحی مضامین کا مجموعہ ہے جو سادہ، بے تکلف اور دلنشین اسلوب کی وجہ سے با مقصد ادب کا عمدہ نمونہ ہے، مرحوم کے لائق صاحبزادے مولانا حبیب ریحان خاں ندوی ازہری نے انکو مرتب کرکے ایک مفید خدمت انجام دی ہے، شروع میں انکے قلم سے مولانائے مرحوم پر ایک عمدہ مضمون بھی ہے۔

(ع۔ ص)